تالیف

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ

مولانا امین احسن اصلاحی

سلسلہ دائرہ حمیدیہ نمبر ۹

تفسیر

سورۂ ذاریات

تالیف

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ

مولانا امین احسن اصلاحی

ناشر

دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، اعظم گڈھ

طبع اول　　　تعداد اشاعت ۱۰۰۰　　　قیمت ایک روپیہ ۱۲ نئے پیسے

مطبوعہ

کوہ نور پرنٹنگ پریس، دہلی

فہرست مضامین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۝ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۝
فَالْمُقَسِّمٰتِ أَمْرًا ۝ إِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّإِنَّ الدِّيْنَ
لَوَاقِعٌ ۝ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۝ إِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝
يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ أُفِكَ ۝ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ
فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ۝ يَسْئَلُوْنَ أَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ۝ يَوْمَ
هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ۝ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ هٰذَا الَّذِيْ
كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝

قسم ہے ہواؤں کی، جو اڑاتی ہیں غبار۔ پھر اٹھا لیتی ہیں بوجھ۔ پھر
چلنے لگتی ہیں آہستہ سے پھر الگ کرتی ہیں معاملہ کو۔ کہ جس بات کا تم
وعدہ کیا جا رہا ہے وہ سچ ہے اور یہ کہ جزا واقع ہو کے رہے گی۔ قسم ہے
دھاریوں والے بادلوں کی بیشک تم ایک اختلاف میں پڑے ہوئے ہو
اس سے وہی روگردانی کرتے ہیں جن کی بصیرت الٹ گئی ہو۔ ناس ہوں

اٹکل دوڑانے والے۔ جو غفلت میں پڑے ہوئے بھولے ہیں۔ پوچھتے ہیں بدلہ کا دن کب آئے گا جس دن وہ آگ پر تپائے جائیں گے۔ چکھو مزہ اپنے فتنہ کا، یہی ہے جس کے لئے تم جلدی مچائے ہوئے تھے۔

۱۔ سورہ کا عمود، سابق سورہ سے اس کا تعلق اور اس کا اندرونی نظم

یہ سورہ ان سورتوں (ذاریات تا واقعہ) میں سے دوسری سورہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کو ایک خاص پہلو سے ثابت کرتی ہیں۔ وہ پہلو یہ ہے کہ قرآن ایک روز جزا کی خبر دیتا ہے اور ان لوگوں کو عذاب کی دھمکی سناتا ہے جو اللہ کا کسی کو شریک بناتے ہیں یا اس کے نبیوں اور اس کی اتاری ہوئی کتابوں کی تکذیب کرتے ہیں۔
ان ساتوں سورتوں میں قرآن کے انہی دعاوی کو ثابت کیا گیا ہے، عمود (مرکزی مضمون) ان تمام سورتوں کا ایک ہی ہے، لیکن اس عمود پر بحث و استدلال مختلف سورتوں میں مختلف پہلوؤں سے ہوا ہے جیسا کہ سابق سورہ (سورہ ق) کی تفسیر میں ہم بیان کر چکے ہیں[1]۔

یہاں ہم اس عمود کے مختلف پہلوؤں میں سے صرف اس پہلو سے بحث کریں گے جو اس سورہ کے ساتھ مخصوص ہے اور جو اس کو سابق سورہ سے الگ کر رہا ہے۔

سابق سورہ میں بعث (حشر و نشر) کو ثابت کیا گیا تھا اور اس سے متعلق مخالفین کے ذہنوں میں جو شبہات تھے ان کی تردید کی گئی تھی۔ اس سورہ میں جزا (قیامت کے

---

[1] سورۂ ق کی تفسیر مصنف رحمۃ اللہ علیہ پوری نہیں لکھ سکے اس وجہ سے وہ اس مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔
(مترجم)

مل بدل دیئے جانے) کو ثابت کیا گیا ہے اور اس سے متعلق شبہات کی تردید کی گئی ہے چنانچہ سابق سورہ یعنی سورہ "ق" کا آغاز یوں ہوتا ہے :-

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ؕ	ق، قرآن مجید کی قسم، بلکہ ان کو
بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ	تعجب ہے کہ ان کے پاس انہی میں سے
مُنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ	ایک ڈرانے والا آیا۔ پس کافروں نے
هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۚ ءَاِذَا	کہا یہ تو عجیب بات ہے۔ آیا جب ہم
مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ	مرجائیں گے اور مٹی ہوجائیں گے تو
رَجْعٌ بَعِيْدٌ ۝	لوٹائے جائیں گے! یہ لوٹایا جانا تو
(ق: ۱-۳)	بہت دور معلوم ہوتا ہے۔

اس کے بعد حشر و نشر پر دلیل قائم کی اور منکرین کے انجام کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا :-

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ	ان سے پہلے انکار کیا نوح کی قوم اور
نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ	کنوئیں والوں اور ثمود نے اور عاد
وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ	اور فرعون اور لوط کے بھائیوں نے
لُوْطٍ ۙ وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ	اور بن والوں نے اور تبع کی قوم
وَقَوْمُ تُبَّعٍ ۭ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ	نے۔ ہر ایک نے انبیاء کا انکار کیا تو
فَحَقَّ وَعِيْدِ ، (ق: ۱۲-۱۴)	ہماری دھمکی واقع ہو کے رہی۔

یہاں ان قوموں کے واقعات کی تفصیل نہیں کی ہے۔ صرف اجمالاً ان کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور ساتھ ہی حشر ونشر کے ثبوت میں وہ سادہ فطری دلیلیں بیان کر دی ہیں جو نہایت کھلی ہوئی تھیں۔ اور اخیر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو استقامت، نماز اور لوگوں کو نصیحت کرتے رہنے کی تاکید فرمائی اور پھر سب سے آخر میں فرمایا:۔

يَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ (ق: ۴۴-۴۵)

جس دن کہ زمین ان کے اوپر سے پھٹ جائے گی اور وہ اس سے سرعت کے ساتھ نکلتے ہوں گے۔ یہ اکٹھا کر لینا ہمارے لئے بہت سہل ہے۔ ہم جانتے ہیں جو کچھ وہ کہتے ہیں۔ اور تم ان پر جبار بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو پس قرآن کے ذریعہ یاد دہانی کرو ان لوگوں کو جو میری وعید سے ڈرتے ہیں

رہی یہ سورہ (ذاریات) تو چونکہ اس کا عمود جزا و سزا کا پہلو ہے اس وجہ سے پہلے جزا و سزا پر شہادتیں پیش کیں، اس کے بعد اصل عمود کو صاف لفظوں میں سامنے رکھ دیا:۔

إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَصَادِقٌ وَإِنَّ الدِّينَ لَوَاقِعٌ

جس بات کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے بالکل سچ ہے اور جزا واقع ہو کے رہے گی

اور یہ وعدہ اور یہ جزا دونوں اپنے اپنے اندر رحمت اور عذاب کے دو مختلف پہلو رکھتے ہیں۔ یہ وعدہ مومنین کے لئے فلاح و کامیابی کا وعدہ ہے اور منکرین کے لئے عذاب و نامرادی کا۔ اسی طرح "دین" یعنی جزاء کا مفہوم یہ ہے کہ ہر صاحب حق کو اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔ نیکوکار اور پرہیزگار کو اس کی پرہیزگاری کا صلہ ملے گا۔ جھگڑالو اور ضدی کو اس کی ضد اور شرارت کی سزا ملے گی۔

ان دونوں پہلوؤں کے لحاظ کے سبب سے ان کے بعد جو واقعات و حالات پیش کئے گئے ہیں ان میں بھی یہ دونوں پہلو ملحوظ ہیں۔ مثلاً فرمایا ہے:۔

وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ ۔	اور آسمان میں تمہاری روزی ہے اور وہ چیز بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

"وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے" کے الفاظ میں جو عمومیت ہے اس کے اندر دونوں چیزیں چھپی ہوئی ہیں۔ ابر رحمت بھی اور صاعقہ عذاب بھی۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی سرگذشت کی طرف اشارہ فرمایا:۔

هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ	کیا تم نے ابراہیم کے محترم مہمانوں کا واقعہ سنا؟

اور یہ سرگذشت بشارت اور عذاب دونوں باتوں کا مجموعہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے پاس جو فرشتے آئے تھے وہ ایک قوم کے لئے زندگی کی بشارت اور دوسری قوم کے لئے موت و ہلاکت کا عذاب لے کر آئے تھے۔ یہ حقیقت سورہ حجر میں نہایت ہی خوبصورتی

کے ساتھ واضح ہوگئی ہے:۔

نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ وَ اَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ	میرے بندوں کو خبر دو کہ میں بخشنے والا مہربان ہوں اور یہ کہ میرا عذاب نہایت دردناک ہے اور ان کو ابراہیم کے مہمانوں کے متعلق خبر دو۔
(حجر: ۴۹-۵۱)	

لیکن چونکہ سورۂ ذاریات میں انذار کا پہلو غالب تھا اس وجہ سے اس میں قوموں کی بربادی کے واقعات ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں مگر آگے چل کر تم دیکھو گے کہ یہ تمام واقعات رحمت اور عذاب دونوں پہلوؤں کو لئے ہوئے ہیں۔ البتہ یہاں رحمت کا پہلو اچھی طرح نمایاں نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پہلو کے بیان کے لئے مستقل سورتیں ہیں جن میں انہی تمام واقعات کے اندر سے اہل ایمان کی نجات کے پہلو کو واضح کیا گیا ہے۔

پس یہاں اس بات کی تفصیل تو نہیں کی لیکن تمام واقعات کے بیان کرنے کے بعد آخر میں اس حقیقت کی طرف ایک اصولی اشارہ کر دیا ہے۔ وہ یوں کہ اللہ واحد نے ہر چیز کو اپنی قوت و حکمت سے پیدا کیا ہے اور ہر چیز کی خلقت اس طرح ہوئی ہے کہ وہ اپنے مقصدِ وجود کو اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر پورا کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ دنیا بے مقصد اور عبث نہیں بنی ہے لیکن اس غایت و مقصد کی تکمیل کے لئے لازمی ہے کہ اس کے لئے ایک دن مقرر ہو جس میں ہر ایک کو اس کے اعمال کا بدلہ ملے اور اس

حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا کہ رحمت کے ظہور کے لئے ضروری ہے کہ عذاب بھی ظہور میں آئے۔

آخر میں توحید کی دعوت ایک ایسے پہلو سے دی ہے جس سے جزا کی دلیل بھی پیدا ہو گئی ہے۔

یہاں ہم مضامین کی طرف بالاجمال اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ تفصیلات انشاء اللہ اپنے اپنے محل میں آئیں گی۔

۲ - الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

(از - ا تا ۱۴)

وَالذّٰرِیٰتِ | الذّٰرِیٰت یعنی الریاح الذاریات (غبار اڑانے والی ہوائیں) ذرو کے معنی ہیں غبار، راکھ یا پتیوں کو اڑانا۔ عربی زبان میں ریاح (ہوا) کے لئے یہ صفت مشہور و معلوم ہے اعشٰی بکر بن وائل کا شعر ہے ؎

فجری با لغلام شبہ حریق   فی یبیس تذ روہ سیاح شمال

(پس وہ گھوڑا نوجوان کو لے کر اس طرح اڑا جس طرح آگ ان خشک پتیوں میں جن کو باد شمال اڑائے لئے پھرتی ہو)

چونکہ یہ صفت ہوا کے لئے مشہور ہے اس وجہ سے عربی زبان کے عام قاعدہ کے مطابق موصوف کو حذف کر دیا، صرف صفت کو ذکر کیا۔ قرآن مجید میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔

فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا جب صفات کا عطف "ف" کے ساتھ ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان صفات میں ترتیب ہے۔ نیز اس سے یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ یہ سب ایک ہی چیز کی صفتیں ہیں۔ بلکہ بسا اوقات "و" کے ساتھ صفت لانے کی صورت میں بھی یہی مطلب سمجھا جاتا ہے۔ اس کی مثال سورہ مرسلات میں موجود ہے۔ پس یہ خیال کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ یہ مختلف چیزوں کی صفتیں ہیں۔ یہ بات نظائر قرآن اور کلام عرب کے خلاف ہے۔ قرآن مجید میں ہے:۔

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۝	گواہی دیتے ہیں وہ جو ہانپتے
فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۝	دوڑتے ہیں، پھر ٹھوکروں سے
فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۝	چنگاریاں نکالتے ہیں، پھر صبح کو
فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۝	دھاوا کرتے ہیں، پھر غبار اٹھاتے ہیں
فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۝	پھر غول میں گھس جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ ساری صفتیں ایک ہی چیز کی ہیں، الگ الگ چیزوں کی نہیں ہیں۔ اسی طرح ابن زیابہ کہتا ہے ؎

یالهف زیابة للحارث　　　الصابح، فالغانم فالآئب

(زیابہ کی طرف سے افسوس ہے حارث پر جس نے غارتگری کی، غنیمت لوٹی اور لوٹ گیا)

علاوہ ازیں ان کو مختلف چیزوں کی صفت قرار دینے کی یوں بھی ضرورت نہیں ہے کہ یہ ایک ہی موصوف کے ساتھ پوری مناسبت کے ساتھ جڑ جاتی ہیں۔ تفصیل آگے آئے گی۔

"وِقر" کے معنی بوجھ اور گرانی کے ہیں۔ یہاں چونکہ بغیر کسی قید کے یہ لفظ آیا ہے۔ اس وجہ سے اس سے ہر وہ چیز مراد لی جا سکتی ہے جس کو ہوائیں اٹھاتی ہوں۔ اس کی تفصیل بھی آگے ملے گی۔ ہم اس سے بادلوں کو بھی مراد لے سکتے ہیں کیونکہ وہ بھی بھاری ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ اور ہواؤں کی صفت میں سب سے زیادہ مشہور و معلوم صفت ان کا بادلوں کو اٹھانا ہی ہے :-

وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ — اور وہی ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو

بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ — اپنی رحمت سے پہلے خوشخبری بنا کر

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا — یہاں تک کہ جب وہ بوجھل بادلوں

ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ — کو اٹھا لیتی ہیں ہم ان کو ہنکاتے

فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ — ہیں کسی مردہ سرزمین کی طرف

(اعراف : ۵۷) — اور بارش برسا دیتے ہیں۔

فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا "قَسَّمَ الْاَمْرَ" کے معنی ہیں کسی امر کے مختلف پہلوؤں کو الگ الگ نمایاں کر دیا۔ یہی معنی قَسَمَ الامرَ کے بھی ہیں لیکن جس طرح کَسَّرَ کے مقابل میں کَسَّرَ میں مبالغہ زیادہ ہے اسی طرح موخر الذکر کے مقابلہ میں مقدم الذکر میں بھی مبالغہ زیادہ ہے۔ موخر ہی مقتضا ہے۔ لبید شعر میں ایک گدھے کی تعریف کرتا ہے جو گھاس کے مواقع کا جائزہ لیتا ہے

ظلّ فی اعلی یفاع حاذلا — یقسم الامر قسم المؤتمر

(وہ ٹیلہ کی بلندی پر سر اٹھائے ہوئے ایک خود رائے کی طرح معاملہ میں فرق و امتیاز کرتا رہا)

اور ہواؤں کے تصرفات اور ان کے فرق و امتیاز کی نیرنگیاں عجیب و غریب ہیں ایک قوم کے ساتھ ان کا معاملہ کچھ اور ہوتا ہے دوسری قوم کے ساتھ کچھ اور۔ کسی قوم کے لئے یہ ابر کرم کی بشارت بن کر نمودار ہوتی ہیں، کسی قوم کے لئے طوفان عذاب بنکر آگے چل کر ہم اس کی کسی قدر تفصیل کریں گے۔

اور یہ جو ایک غیر عاقل چیز کی طرف ایک ارادی فعل کی نسبت کی گئی ہے تو یہ اسلوب کلام عرب اور قرآن مجید دونوں میں کثرت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

اِنَّمَا تُوعَدُونَ لَصَادِقٌ "توعدون" "وعد" سے ہے یعنی وہ تمام باتیں جن کا انبیاء کی زبانی وعدہ کیا گیا ہے اور جن پر نہایت قطعی اور واضح دلیلیں قائم ہو چکی ہیں قرآن مجید میں بار بار یہ بات دہرائی گئی ہے کہ قیامت، حشر و نشر اور اعمال کے مطابق جزاء و سزا یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہیں۔ مثلاً :۔

اِلَیْهِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعاً،	اسی کی جانب تم سب کا لوٹنا ہے،
وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا، اِنَّهٗ	اللہ کا پورا ہونے والا وعدہ ہے
یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ	وہی خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہی
لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ آمَنُوْا الآیه	اس کا اعادہ کرے گا تا کہ ایمان لانے
(یونس : ۴)	والوں کو بدلہ دے۔

دوسری جگہ فرمایا :۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ	اور انھوں نے پکی قسمیں کھائیں کہ

اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ ... (آیت)	مرجانے والوں کو اللہ نہیں اٹھائیگا
مَنْ یَّمُوْتُ بَلٰی وَعْدًا	ہاں ضرور اٹھائے گا۔ یہ اس پہ وعدہ
عَلَیْهِ حَقًّا (نحل: ۳۸)	ہے جو پورا ہو کے رہے گا۔

نیز فرمایا:۔

لِیَعْلَمُوْا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ	تاکہ وہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ
حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا	سچا ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی
رَیْبَ فِیْهَا (کهف: ۲۱)	شک نہیں۔

اس مضمون کی آیتیں بہت ہیں۔

مومنوں کے لئے غلبہ اور کافروں کے لئے ناکامی و نامرادی کا جو وعدہ ہے وہ بھی اس میں شامل ہے چنانچہ فرمایا ہے:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا	تم میں سے جو ایمان لائے اور بھلے
مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	کام کئے۔ اللہ نے ان سے وعدہ
لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ	کیا ہے کہ ان کو زمین میں جانشینی
كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ	دے گا جیسے کہ اس نے ان کو جانشینی
مِنْ قَبْلِهِمْ (نور: ۵۵)	دی جو ان سے پہلے تھے۔

یہ مضمون بھی کئی جگہ بیان ہوا ہے۔ پس اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ کے عموم میں ویسے تو یہ ساری ہی باتیں آجائیں گی لیکن یہاں موقع کی مناسبت اس کو حشر و نشر کے ساتھ مخصوص

کر رہی ہے۔ کیونکہ اوپر کی آیات اور بعد کی آیات میں جزار و سزا کے واقع ہونے کا جو بیان ہوا ہے وہ اس مضمون سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

وَإِنَّ الدِّينَ لَوَاقِعٌ | دین — جزار و سزا — یہ بھی "ما توعدون" کے عموم میں داخل ہے۔ یہ عطف، عطف خاص علی العام یا عطف جزر علی الکل کی قسم کا عطف ہے۔ یہ اسلوب اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب معطوف کو خاص اہمیت کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہو۔ یہاں اس کا موقع بالکل ظاہر ہے کیونکہ موت کے بعد اٹھائے جانے سے اصلی مقصود دین (جزار و سزا) ہی ہے۔ اس کی تصریح قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مقامات میں موجود ہے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ | لفظ "سماء" بہت سے معانی کے لئے بولا جاتا ہے۔ از انجملہ اس کا اطلاق بادلوں پر بھی ہوتا ہے مثلاً :-

قِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي — اے زمین اپنا پانی جذب کر لے اور

مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي — اے آسمان (بادل) تھم جا۔

ہمارے نزدیک وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ میں بھی سماء سے مراد بادل ہی ہیں، اور اس کے وجوہ یہ ہیں :-

۱ - اوپر ہواؤں کی قسم کھائی ہے۔ اور ہواؤں اور بادلوں کی مناسبت بالکل ظاہر ہے۔ قرآن مجید میں کئی جگہ دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ ہوا ہے۔

۲ - مقسم علیہ اور مقسم بہ کی مناسبت اسی معنی کو چاہتی ہے۔ اس کی تفصیل

اپنے محل میں آئے گی۔

۳۔ "ذات الحبک" کی صفت بھی اسی معنی کی ترجیح کے حق میں ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ "حُبُک" کے معنی باندھنے اور گرہ لگانے کے ہیں ابو دواد کہتا ہے ؎

کان العضون من الفہد تین   الحاطرف الزوس حبلث العقل

یہیں سے یہ اس مضبوطی اور استواری کے لئے استعمال ہوا جو کسی چیز کی بناوٹ میں پیدا کی جائے۔ اسی سے حباک ہے جس کی جمع "حبک" آتی ہے حباک ان دھاریوں، شکنوں اور لہروں کو کہتے ہیں جو کسی گنفش اور مضبوط بناوٹ کے کپڑے میں نمایاں کی گئی ہوں۔

زہیر بن ابی سلمیٰ اپنے ایک شعر میں ایک چشمہ کا ذکر کرتا ہے جس پر سے ہوا نے گذر کر اس میں لہریں پیدا کر دی ہیں۔ ؎

مکلل بااصول النبت تنسجہ   ریح خریق لضاحی مائہ حبک

(نباتات اس کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، تیز و تند ہوا اس پر سے گذرتی ہے تو اس کی کھلی ہوئی سطح پر لہریں نمودار ہو جاتی ہیں)

فرار "ذات الحبک" کی تفسیر کرتے ہوئے کہتا ہے "حبک سے مراد وہ لہریں اور شکنیں ہیں جو ریت یا ساکن پانی میں، جب کہ اس پر ہوا چل گئی ہو، پیدا ہو جاتی ہیں"۔ دجال والی حدیث میں ہے "ان شعرہ حبک حبک" اس کے بال شکن در شکن

ہوں گے۔ بیش یہ بادلوں کی تعریف کے لئے استعمال ہونے لگا کیونکہ بادلوں کے ٹکڑے بھی آسمان میں تہہ بہ تہہ موجوں اور توبہ تو روئی کے گالوں کی طرح نظر آتے ہیں۔

امرا القیس ایسے فلک بوس محلوں کی تعریف کر رہا ہے جن پر ابر چھایا ہوا ہے ۵

تلاعب اولاد الوعول سباعھا — دوین السماء فی رؤس المجادل

....

مکللۃ حمراء ذات اسرۃ! — لھا حبک کانھا من وصائل!

(ان محلوں پر سرخ اور دھاریوں والے بادل چھائے ہوئے ہیں، گویا کہ منقش چادریں ہیں)

"مکللۃ حمراء ذات اسرۃ" یعنی جن پر سرخ رنگ اور دھاریوں والے بادل چھائے ہوئے ہیں۔

یہ موسم سرما کے بادلوں کی تعریف ہے اور یہ ان کی تہوں اور ان کے رنگ کی نہایت صحیح تصویر ہے۔ مشہور شاعرہ خنساء نے موسم سرما کے انہی بادلوں کا ذکر کیا ہے۔[۵۵]

حین الریاح بلا ئل — نکب ھوا بجھا صوارد

(جس وقت کہ ٹھنڈی اور ترچھی ہوائیں چلتی تھیں جن کے جھونکے سرد ہوتے تھے)

ینفین عن لیط السماء — عظلا ثلاء والماء جامد

(وہ آسمان سے بادلوں کو ہنکاتی تھیں اور پانی جما ہوا ہوتا تھا)

معترقا تطرد ھا الریا — ح کانھا خرق طرائد

(بادلوں کے ٹکڑے جن کو ہوائیں ہنکائے پھرتی ہیں گویا ٹڈیوں کے دل ہیں جن کو ہوا اڑائے پھرتی ہے)

جن لوگوں نے "ذات الحبک" سے چرخ مکوکب کو مراد لیا ہے، خواہ اس کی مضبوطی واستواری کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ اس میں تارے ٹنکے ہوئے ہیں، ہمارے نزدیک ان کی رائے صحیح نہیں ہے۔ "حبک" یہاں مصدر نہیں ہے، بلکہ جمع ہے اور یہ لفظ دھاریوں، شکنوں، لہروں اور خطوط کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ پس اس سے اس تاروں والی چھت کو مراد لینا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ خواہ اس کی مضبوطی کا پہلو پیش نظر ہو یا جگمگاتے ہوئے تاروں کی تابانی کا لحاظ ہو۔

| اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ | تم اختلاف میں ہو —— یعنی جزا و سزا کے واقع ہونے کے بارے میں۔ جیسا کہ فرمایا ہے:۔

عَمَّ يَتَسَاءَلُوْنَ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ۔ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ	کس چیز کی ان میں پوچھ کچھ ہو رہی ہے؟ اس بڑی خبر کی، جس میں کوئی کچھ کہہ رہا ہے اور کوئی کچھ۔ کچھ نہیں! ابھی انھیں معلوم ہو جائیگا۔

موقع کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جواب قسم نہیں ہے بلکہ منکرین کے قول پہ ملامت اور سرزنش ہے جواب قسم پہلی قسم کے بعد گذر چکا ہے جس کے بعد دوبارہ اس کے ذکر کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قسم کے بعد ملامت وسرزنش کا جملہ آتا ہے اور ایسے مواقع پہ جواب قسم نہیں لایا جاتا بلکہ وہ موقع سے سمجھ لیا جاتا ہے۔ مثلاً:۔

قٓ، وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ	ق ۔ قرآن مجید کی قسم، بلکہ
بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ	ان کو تعجب ہے کہ ان کے پاس
مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ	ڈرانے والا انہی میں سے آیا
الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ	تو کافروں نے کہا یہ عجیب
عَجِيْبٌ، (ق: ۱-۲)	بات ہے،

اس آیت میں جواب قسم کی جگہ ایک ملامت کا جملہ رکھ دیا گیا ہے۔ بعینہٖ یہی اسلوب سورہ بروج میں بھی ہے :۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ	قسم ہے برجوں والے آسمان کی،
وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ وَشَاهِدٍ	اور وعدہ کئے ہوئے دن کی، اور
وَّمَشْهُوْدٍ، قُتِلَ اَصْحٰبُ	دیکھنے والے کی اور جو دیکھا، ناس
الْاُخْدُوْدِ	ہوں ایندھن بھری آگ کی
۔۔۔۔۔۔۔۔۔	گھاٹی والے۔

اس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔

يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ | یہ ایک مستقل جملہ ہے۔ یہ (قول مختلف) کی صفت نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ بصیرت سے محروم ہوتے ہیں وہ جزا پر ایمان نہیں لاتے۔ "اُفک" کے معنی ہیں کسی شئے کو الٹ دینا۔ اسی سے افک ہے جس کے معنی جھوٹ اور دروغ کے ہیں۔ مافوک کے معنی محروم بصیرت کے ہیں۔ لیث کا مصرعہ ہے ؎

مالی ادراك عاجزا فیھا

(کیا بات ہے میں تم کو ایک عاجز اور محروم بصیرت پا رہا ہوں)

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ خَرَصَ النَّخلَ والکرمَ کے معنی ہیں کھجور کے درخت یا انگور کی بیل میں جو پھل ہیں ان کا تخمینہ کیا، خَرَصَ فی الحدیثِ کے معنی ہیں ایک بات بے جانے بوجھے یونہی اڑا دی۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ قیامت کے بارے میں مختلف قسم کی باتیں محض اٹکل سے کہتے ہیں۔ ان باتوں کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اس مضمون کو قرآن مجید نے دوسرے الفاظ میں ایک سے زیادہ مقامات میں بیان کیا ہے مثلاً:۔

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ، بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا (نمل: ٦٦)	بلکہ ان کا علم آخرت کے بارے میں گڈمڈ ہوگیا ہے، بلکہ وہ اس کی طرف سے شک میں ہیں۔

دوسری جگہ قیامت کے بارہ میں ان کا قول نقل کیا ہے۔

اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ (جاثیہ: ٣٢)	محض ایک گمان ہے جو ہم کر رہے ہیں اور ہم یقین کرنے والے نہیں

اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ

فی غمرۃ یعنی شدید غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اسی مضمون کے لئے فی غطاء یا فی عمایۃ وغیرہ کے الفاظ بھی عربی میں مستعمل ہیں۔ "ساہون" خبر کے بعد دوسری خبر ہے۔ اس اسلوب کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے غفلت کا دوام و استمرار ظاہر ہوتا ہے یعنی ان پر غفلت کی

ایسی نیند طاری ہے؟ کسی وقت ٹوٹتی ہی نہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کے احساس سے بالکل محروم ہیں جن کے احساس سے ان کو محروم نہیں ہونا تھا۔ یہ ان کی اس حالت کا بیان ہے جو ان کی اس بیماری کی جڑ ہے جس کا ذکر اوپر ہوا یعنی غفلت اور شہوات میں انہماک کے سبب سے ان کی عاقبت بینی کی آنکھیں بند ہو گئیں ہیں۔ اس جملہ کا مقصود ان کے اس تنک پر ملامت کرنا ہے، جو ان کے کمال جسارت، اور آخرت اور تعلیم انبیاء سے بے پروائی کا نتیجہ ہے۔ اور اس حقیقت کا اظہار بعد کے سوال سے ہو رہا ہے۔

اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ

یہ سوال انکار، جلد بازی اور استہزا، تینوں باتوں کا اظہار کر رہا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ نافرمانی و سرکشی کی آخری حد ہے۔ سورہ قیامہ میں بھی یہ سوال موجود ہے اور وہاں بھی اسی نوعیت سے یہ آیا ہے جس نوعیت سے یہاں آیا ہے :-

بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ۔ يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ (قیامہ : ۵-۶)	بلکہ انسان چاہتا ہے کہ خدا کے سامنے نافرمانی کرے۔ وہ پوچھتا ہے قیامت کب آئے گی؟

چنانچہ جواب ٹھیک سوال کرنے والوں کی ذہنیت کو سامنے رکھکر دیا ہے۔

يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ

یوم کا نصب بربنائے ظرفیت ہے۔ یعنی جزا کا دن اس روز ظہور میں آئے گا جس دن وہ آگ پر تپائے جائیں گے۔ یہاں 'یوم' بمعنی وقت ہے۔ اس معنی کے لئے

قرآن میں شواہد موجود ہیں مثلاً فَذٰلِکَ یَوْمَئِذٍ یَّوْمٌ عَسِیْرٌ۔ یومئذٍ۔ یعنی وقتئذٍ۔ بعضوں نے اس کو محل رفع میں قرار دیا ہے اور نصب کی وجہ غیر متمکن کی طرف مضاف ہونا بتایا ہے۔ اگرچہ یہ بات اصول اعراب کے خلاف نہیں ہے لیکن یہاں یہ صورت موزوں نہیں ہے۔ یہاں اوپر کا سوال یوم جزا کے موقع کے متعلق ہے نہ کہ نفس یوم جزا کے متعلق۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ جواب میں اس مفہوم کی رعایت ہو جو ان کے سوال سے سمجھ میں آتا ہے۔ گویا ان کا سوال یوں ہے کہ یا ہٰذا الدین یہ جزا کب ہے؟ اور اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ وہ فلاں دن پیش آئے گی۔

فَتَنَہٗ کے معنی ہیں اس کو پرکھا، جانچا، اس کا امتحان کیا۔ قرآن میں ہے وَفَتَنّٰکَ فُتُوْنًا (اور ہم نے تم کو جانچا اچھی طرح) یہیں سے فتنہ ہر اس رنج و راحت کو کہنے لگے جس سے انسان کی عقل اور اس کی عزیمت کا امتحان ہو سکے۔ "فَتَنَتْہُ الْمَرْأَۃُ" کے معنی ہیں عورت نے اس کو فریفتہ کر لیا "فَتَنَہُ الشَّیْطَانُ" کے معنی ہوں گے، شیطان نے اس کو ورغلایا۔ "فَتَنْتُ الذَّھَبَ" کے معنی ہیں سونے کو آگ میں ڈال کر اس کے کھرے کھوٹے کو پرکھ لیا۔ یہیں سے دینار مفتون اور ورق فتین وغیرہ کے استعمالات پیدا ہو گئے۔ اس پتھریلی زمین کو فتین کہتے ہیں جس کے پتھر جلے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ سب کے سب ایک ہی معنی کے مختلف پہلو ہیں۔ پس یہاں یُفْتَنُوْنَ کے لفظ سے دو معانی کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ ایک تو جلانے کے معنی کی طرف، دوسرے اس بات کی طرف کہ جس آگ سے یہ جلائے جائیں گے یہ ان شہوات اور زخارف کی

آگ ہوگی جن سے وہ آزمائے گئے تھے، اور جن میں پڑ کر وہ جزار کے دن سے بے پروا ہوئے اور اپنی سرمستیوں میں کھوئے گئے۔ بعد کے ٹکڑے سے اس مفہوم کی توضیح ہوتی ہے اور چونکہ سوال میں ہٹ دھرمی اور استہزار کا انداز تھا اس وجہ سے جواب ان کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر دیا ہے۔

ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ یعنی دنیا کی جن چیزوں پر تم ریجھے ہوئے تھے ان کی اصلی حقیقت اب تمہارے سامنے کھل گئی۔ وہاں تم غفلت اور بھول میں پڑے ہوئے تھے اس وجہ سے ان کا اصلی مزہ نہ معلوم کر سکے تھے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ان کے اصلی مزہ سے واقف ہو جاؤ۔

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ کلام میں یہاں کچھ حذف ہے۔ حذف نہیں ہے بلکہ موقع کلام التفات کا ہے۔ غائب کو سامنے کر دینے کے لئے ان کو مخاطب کر دیا گیا ہے، گویا جزار کا دن آگیا ہے، وہ آگ کے سامنے کھڑے ہیں اور یہ بات ان سے کہی جا رہی ہے۔

۳ - ابر و ہوا سے جزا و سزا پر استدلال کا پہلو

اوپر کی تفصیلات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ "وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا ... فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا" میں ہوا کو اور "وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ" میں سرما کے ان بادلوں کو جو کڑک اور دمک کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں جزار و سزا کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ چونکہ انذار و تخویف کے پہلو سے یہ چیزیں نہایت واضح ہیں اس وجہ سے ان کے ہوتے ہوئے غفلت و سرمستی میں

بڑے، بہلا تر دو وہ مذبذب میں گرفتار رہنا نہایت صریح حماقت ہے۔ چنانچہ یہی حال قوم عاد کا بیان ہوا ہے :-

قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا	بولے یہ بادل ہے جو ہم پر برسنے والا
بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ	ہے، بلکہ یہ وہ چیز ہے جس کے لئے
بِهٖ رِیْحٌ فِیْهَا عَذَابٌ	تم جلدی مچائے ہوئے تھے۔ ہوا
اَلِیْمٌ۔ (احقاف : ۲۴)	جس کے اندر دردناک عذاب ہے

عذاب الٰہی آچکا تھا اور اس کے آثار انھوں نے بادلوں کے تہ بہ تہ ٹکڑوں میں دیکھ بھی لئے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کی آنکھیں نہیں کھلیں۔

اس اجمال کو کسی قدر وضاحت کے ساتھ سمجھ لینا چاہیئے۔

یہ دونوں شہادتیں درحقیقت اللہ تعالیٰ کی نہایت کھلی ہوئی نشانیوں کی شہادتیں ہیں۔ ہواؤں اور بادلوں کے تصرفات عجیب عجیب صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ کبھی ہوائیں اٹھتی ہیں، بوجھل بادلوں کی تشکیں اپنی پیٹھوں پر لادتی ہیں اور ان کو بنجر سیدانوں میں لے جاکر ان کو جل تھل کر دیتی ہیں۔ کبھی سمندروں میں سامان سے بھری ہوئی کشتیوں کو کھیتی ہیں جن سے تجارت و معیشت کے بے شمار فوائد ظہور میں آتے ہیں۔ کبھی ریگستانوں سے حاصب بنکر ابھرتی ہیں اور آبادبستیوں کو ریت اور پتھروں سے ڈھانک دیتی ہیں۔ کبھی صرصر بن کر اولے اور کڑک کے عذاب کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں۔ کبھی طوفان بنکر سیلاب انگیز بارشیں لاتی ہیں اور سمندروں میں ہیجان پیدا کر دیتی ہیں۔

ہواؤں اور بادلوں کی یہی مختلف حالتیں ہیں جن کو قرآن نے "تقسیم امر" سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت اور اس کے اختیار و تصرف کی ایک عجیب شان ہے کہ وہ کبھی ہوا کی تندی اور شدت کو ایک قوم کے لئے نجات کا ذریعہ بنا دیتا ہے اور کبھی اس کی نرمی اور اس کے سکون سے اس کو تباہ کر دیتا ہے۔ اس کی بہترین شہادت فرعون اور اس کے لشکر کی سرگذشت میں موجود ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

اسی طرح کبھی ایک ہی چیز رحمت اور عذاب دونوں بن جاتی ہے۔ اہل ایمان کے لئے اس میں برکتیں اور رحمتیں چھپی ہوئی ہوتی ہیں اور منکرین کے لئے اس کے اندر عذاب کا تازیانہ ہوتا ہے۔ اور یہ چیز خدا کی اس رحمت اور اس کے اس غضب کو اس کے مستحقین میں الگ الگ اس طرح تقسیم کرتی ہے جس طرح ایک عاقل ایک چیز کو اچھی طرح پہچان پہچان کر تقسیم کرتا ہے۔

اسی سے ملتی جلتی ہوئی بات زبور ۱۴۷: ۱۵ - ۱۸ میں بھی ہے :-

وہ اپنا حکم زمین پر بھیجتا ہے۔
اس کا کلام نہایت تیز رو ہے۔
وہ برف کو اون کی مانند گراتا ہے۔
اور پالے کو راکھ کی مانند بکھیرتا ہے۔
وہ یخ کو لقموں کی مانند پھینکتا ہے۔

اس کی ٹھنڈ کون سہ سکتا ہے؟

وہ اپنا کلام نازل کر کے ان کو پگھلا دیتا ہے۔

وہ ہوا چلاتا ہے اور پانی بہنے لگتا ہے۔

اس عبارت میں دیکھو، ہوا کو کلمۂ رب (حکم خدا) سے تعبیر کیا ہے اور پھر یہ اسی کے سارے کرشمے بیان کئے ہیں۔ یہ اسلوب ایک نہایت لطیف اسلوب ہے کیونکہ عبرانی میں ہوا اور کلام دونوں کے لئے ایک ہی لفظ ہے۔

قرآن مجید کی ایک ہی جامع آیت میں یہ ساری باتیں اکٹھی ہو گئی ہیں:۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ	بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش
وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ	اور رات و دن کی گردش اور
وَالنَّهَارِ وَالْفُلْکِ الَّتِیْ	ان کشتیوں میں جو سمندر میں
تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا	لوگوں کے نفع کی چیزیں لے کر چلتی ہیں
یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ	اور اس پانی میں جو خدا نے
مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ	آسمان سے اتارا، پس اس سے
فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ	زمین کو اس کے مردہ ہونے کے
مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ	بعد زندہ کیا اور اس میں ہر قسم کے
دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ	جانور پھیلائے اور ہوا کی گردش
وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ	میں اور بادلوں میں جو آسمان و زمین

بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ — کے درمیان مسخر ہیں عقلمندوں
لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (بقرہ: ۱۶۴) — کے لئے دلیلیں ہیں۔

لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ"۔ اس میں نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لئے۔ یعنی اس میں دلیلیں ہیں توحید، قدرت، ربوبیت، رحمت، حکمت اور عدل پر۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ ہواؤں اور بادلوں کا اس طرح گردش کرنا جس میں عام خلق الٰہی کے لئے نفع کا اور خاص خاص جماعتوں کے لئے نقصان کا پہلو نمایاں ہو اس امر کا بین ثبوت ہے کہ یہ کارخانہ خلق بے مقصد اور بے نظام نہیں چل رہا ہے۔ یہ ہوائیں برے اور بھلے کے درمیان امتیاز کرتی ہیں۔ ایک قوم کے لئے یہ عذاب بن کر نمودار ہوتی ہیں دوسری کے لئے رحمت بن کر۔ پس یقیناً یہ سارا کارخانہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت کے مطابق چل رہا ہے۔

نیز اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے اختیار اور قابو میں ہے یہاں تک کہ ہوا، جو ایک بالکل بے سمجھ بوجھ مخلوق ہے، وہ بھی خدا کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کرتی اور اس کی حرکت ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے عدل و حکمت کے ظہور کی بنا پر ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے:۔

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ — اور اللہ ہی کے لئے ہیں آسمانوں
وَالْاَرْضِ — اور زمین کی فوجیں۔

ہواؤں کے عجیب و غریب تصرفات اس امر پر بھی دلیل ہیں کہ غلبہ و نصرت ہمیشہ

اللہ تعالیٰ کی جماعت کے لئے ہے۔ اس کی وضاحت سورہ وَالصّٰفّٰت میں بھی ملتی ہے، جس کے شروع میں خدا نے اپنی افواج کی قسم کھائی ہے اور پھر فرمایا ہے :۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۔	(صافات ۳۷: ۱۷۱-۱۷۳)	اور ہمارا حکم پہلے ہو چکا ہے اپنے فرستادہ بندوں کے لئے کہ وہی فتحمند ہوں گے اور ہماری ہی افوج غالب ہونے والی ہوگی

پھر یہ سب مل کر جزا کی نہایت واضح دلیل ہیں۔ یہاں ہم ان اجمالی اشارات پر بس کرتے ہیں۔ آگے چل کر جب ہم ان قوموں کے حالات کی تفصیل کریں گے جو ہواؤں کے تصرفات سے تباہ ہوئی ہیں تو وہاں ان ہواؤں اور بادلوں کے گوناگوں کرشمے تمہارے سامنے آئیں گے۔

۴ ۔ ان آیات کا باہمی نظم اور آیات مابعد سے ان کا تعلق

ہواؤں کی شہادت، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، اپنے اندر رحمت اور عذاب دونوں کے پہلو رکھتی ہے۔ سورہ مرسلات کی تفسیر میں اس کی پوری تفصیل ملے گی ۔ قرآن نے ان کے نفع کے پہلو کو اکثر مقامات میں بیان فرمایا ہے اور کہیں کہیں ان کے عذاب کے پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ ان کی باگ ایک صاحب حکمت و قدرت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ پس معاملہ کے اس پہلو کے لحاظ سے مناسب ہوا کہ

اس شہادت کے بعد کوئی ایسی بات کہی جائے، جو رحمت اور عذاب دونوں کو عام ہو۔ چنانچہ فرمایا:۔

إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَصَادِقٌ ۔ وَإِنَّ الدِّينَ لَوَاقِعٌ

جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے سچ ہے اور جزا و سزا واقع ہو کے رہے گی۔

اور "وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْحُبُكِ" (دھاریوں والے آسمان) کی شہادت میں چونکہ انذار کا پہلو غالب تھا۔ کیونکہ موسم سرما کے سرخ سرخ اور تہہ بہ تہہ بادلوں کی صورت ہی زجر و تنبیہہ ہے، اس وجہ سے مناسب ہوا کہ اس کے بعد آخرت کا مذاق اڑانے والوں اور عذاب کے لئے جلدی مچانے والوں کا ذکر آئے۔ پھر چونکہ یہ وعدہ اور جزا کے ایک ہی پہلو کا بیان تھا، اس وجہ سے مناسب ہوا کہ اس کے بعد اس کا دوسرا پہلو بھی بیان ہو یعنی منکرین کے انجام کے ساتھ ساتھ اہل ایمان کے صبر و تقویٰ کا ثمرہ بھی بیان کر دیا جائے۔ یہ بات قرآن کریم کے عام اسلوب کے لحاظ سے بھی ضروری تھی کیونکہ قرآن مجید ترہیب کے بعد ترغیب، اور ایک چیز کے ساتھ اس کے مقابل کا بیان ضرور کرتا ہے۔ پس چونکہ یہاں نافرمانوں کا اور ان کی بعض خصوصیات کا ذکر ہوا تھا اس وجہ سے ان کی مدمقابل جماعت اور اس جماعت کی بعض نمایاں خصوصیات کا بھی ذکر ہوا۔ اور اس طرح کنایۃً گویا یہ بات واضح کر دی گئی کہ یہ منکرین نیکوکاروں کی خصوصیات سے کوسوں دور ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنّٰتٍ وَّعُيُونٍ ۝١٥ آخِذِينَ مَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِينَ ۝١٦ كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ ۝١٧ وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ۝١٨ وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُومِ ۝١٩

پرہیزگار باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ لے رہے ہوں گے جو بخشا ہے ان کو ان کے پروردگار نے بے شک وہ اس سے پہلے نیکوکاروں میں تھے۔ راتوں کو کم سوتے تھے، صبح کے وقتوں میں مغفرت مانگتے تھے، اور ان کے مالوں میں سائل اور بے زبان محتاج کا حق تھا۔

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

(آیات ۱۵ – ۱۹)

اَلْمُتَّقِينَ ایک جامع اور امتیاز قائم کرنے والی صفت ہے۔ اس کی تفصیل سورہ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ یہاں موقع و محل کے اشارہ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اوپر کی آیات میں منکرین کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں یہ ان کے بالکل ضد صفات رکھنے والا گروہ ہے۔

فِي جَنّٰتٍ وَّعُيُونٍ یہ مسرت و کامیابی کی تعبیر ہے۔ یعنی یہ لوگ ہمیشہ نعمت و فراغت میں رہیں گے۔

آخِذِينَ حال واقع ہے اور اس کے حال ہونے میں ایک خاص خوبی ہے۔ یہ اس

امر پر دلیل ہے کہ یہ نعمت ان کے لئے ہمیشہ باقی رہے گی اگر اس کی جگہ "اِنَّهُمْ آخِذُونَ مَا اٰتٰهُمْ" ہوتا تو یہ خوبی نہ پیدا ہوتی۔ سابق جملہ میں دوام نعمت کا مضمون نہایت واضح طور پر موجود ہے۔ اس کے بعد اس طرح پر حال لانے کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ متقی لوگ برابر باغوں، چشموں، اور اپنے پروردگار کی بخششوں میں رہیں گے۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا | یہ اگرچہ صفت ہے لیکن موقع میں دلیل کے ہے۔ اس سے یہ بھی اظہار ہو رہا ہے کہ منکرین کی صفات ان کی صفات کے بالکل برعکس ہیں۔ قرآن مجید میں اس اسلوب کی مثالیں بہت ہیں۔ اس جملہ میں التفات کی شان نمایاں ہے اور یہ بالکل "ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ" کے انداز کا جملہ ہے۔ گویا قیامت کا دن آچکا ہے اور یہ لوگ دنیا کی زندگی میں جن صفات وفضائل سے متصف تھے ان کا بیان ہو رہا ہے۔

مُحْسِنِيْنَ | عام ہے لیکن چونکہ نماز اور زکوٰۃ تمام نیکیوں میں سب سے زیادہ اہم اور مقدم ہیں اور ان دونوں کو اہل ایمان کی ایک امتیازی خصوصیت قرار دیا گیا ہے، اس وجہ سے ان کی زندگیوں میں یہ دونوں چیزیں سب سے زیادہ نمایاں ہوں گی۔ چنانچہ بعد کی آیتوں میں ان لوگوں کی شب بیداری اور فیاضی کا ذکر ہے بھی۔

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ | ہجوع کے معنی سونے کے ہیں۔ یعنی وہ شب میں ذکر الٰہی اور نماز میں مشغول رہتے تھے۔ صرف آرام نہیں کیا کرتے تھے۔

یہی حال ان کا دوسری جگہ بیان ہوا ہے:۔

تَتَجَافیٰ جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ - (سجدہ : ۱۶)

ان کے پہلو بستروں سے دور رہتے ہیں وہ اپنے پروردگار کو یاد کرتے ہیں، بیم و رجا کے ساتھ اور جو کچھ ہم نے انھیں روزی بخشی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں -

سورہ مزمل میں فرمایا ہے :-

يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا - (مزمل : ۱-۲)

اے چادر میں لپٹنے والے راتوں میں قیام کر مگر کچھ حصہ -

یہ جملہ ان کے محسن ہونے کی تفصیل ہے، اس لئے بغیر عطف آیا، اس کی نحوی ترکیب مختلف طریقوں سے ہو سکتی ہے لیکن مطلب ہر صورت میں ایک ہی ہوگا - اس کی ایک شکل یہ ہو سکتی ہے کہ "انہم کانوا قلیلا ھجوعہم" (ان کا شب میں سونا تھوڑا تھا) دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ "کانوا قلیلا ما یھجعون فیہ من اللیل" (شب میں ان کے سونے کا حصہ تھوڑا تھا) ایک تیسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ "وکانوا یھجعون قلیلا من اللیل" (رات میں وہ تھوڑا سوتے تھے) ان کے علاوہ اس کی ایک ترکیب امام رازیؒ نے بتائی ہے اور وہ یہ ہے کہ "انھم کانوا قلیلین وانھم لا یھجعون من اللیل" (وہ تھوڑے تھے اور شب میں سوتے نہیں تھے) ہمارے نزدیک یہ ترکیب نہایت بعید از قیاس اور بالکل ناقابل التفات ہے -

وَبِالْاَسْحَارِ | پو پھٹنے سے کچھ پہلے کا وقت سحر کا وقت کہلاتا ہے۔ یہ وقت استغفار کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ ایک اور جگہ بھی متقین کی تعریف میں اس چیز کا ذکر فرمایا ہے :۔

اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ	صبر کرنیوالے، راست بازی اختیار کرنیوالے
وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ	خدا کی طرف دھیان رکھنے والے،
وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ	اللہ کی راہ میں خرچ کرنیوالے اور سحر کے
(آلعمران: ۱۷)	وقتوں میں مغفرت چاہنے والے۔

صحیح حدیثوں میں بھی استغفار کے لئے اس وقت کی موزونیت کا ذکر ہے ہم نے تفسیر سورہ آلعمران میں اس کی وجہ سے بحث کی ہے "وبالاسحار" میں جو واو ہے اس سے حضرت حسنؒ نے ایک لطیف نکتہ پیدا کیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ "و" متقین کی دونوں صفتوں کے اتصال کی ہے یعنی یہ متقین نماز میں ایسے مستغرق اور منہمک ہوتے ہیں کہ سحر کے استغفار کا وقت آجاتا ہے۔ آیت کے لفظوں کا ظاہر مطلب تو یہ نہیں ہے لیکن نکتہ ہے لطیف۔

اَلْمَحْرُوْمِ | لفظ سائل کے بعد اس لفظ کا آنا اس کے معنی پر روشنی ڈالتا ہے یعنی وہ شخص جو ضرورت کے باوجود لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ قتادہؒ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "وہ مسکین جو لوگوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے"۔ زہریؒ فرماتے ہیں کہ "محروم کے معنی خوددار کے ہیں" ان حضرات کی نظر غالباً اس آیت پر ہے :۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا

(بقرہ: ۲۷۳)

ان محتاجوں کے لئے جو خدا کی راہ میں گھر گئے ہیں زمین میں (تلاش معاش) کے لئے نقل و حرکت نہیں کر سکتے، جاہل ان کو ان کی خودداری کے باعث غنی سمجھتا ہے مگر تم ان کو ان کی پیشانی سے پہچان سکتے ہو۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔

۶ - ان آیتوں کا باہمی نظم، ان کا مطلب، اور ماقبل و مابعد سے ان کا تعلق

مقابلہ کے اصول پر کافروں کے ذکر کے بعد اہل ایمان کا بھی ذکر فرمایا اور ایجاز کلام کی خوبی یہ ہے کہ جس قدر بات کہی گئی ہے وہ آپ سے آپ ان بہت سی باتوں پر دلیل بن گئی ہے، جو کہی نہیں گئی ہیں، منکرین کی بابت فرمایا ہے کہ وہ غفلت کی مدہوشی میں پڑے ہوئے ہیں، اس سے یہ بات خود بخود نکل آئی کہ اہل ایمان کے سامنے روز جزا کے متعلق یقین و بصیرت کی پوری روشنی موجود ہے اور وہ اس دن کے انتظار میں برابر جاگ رہے ہیں اور خوبی یہ ہے کہ یہ سارا مضمون صرف ایک لفظ "متقین" سے سامنے آگیا ہے

کیونکہ تقویٰ تمام بصیرت کی اصل ہے۔ اس مسئلہ پر پوری بحث اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

اسی طرح متقین کے لئے جو صفتیں بیان ہوئی ہیں، ان میں احسان، نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ہوا ہے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ منکرین بخیل اور سخت دل ہیں۔ چنانچہ ایک مقام میں تصریح کے ساتھ اس کا ذکر بھی موجود ہے:۔

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ، وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ، (مدثر: ۴۳ و ۴۴)	کہیں گے نہ ہم نماز پڑھنے والوں میں تھے اور نہ مسکین کو کھانا کھلاتے تھے۔

یہ آیتیں جو "اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ" کے بعد شروع ہو کر "حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ" پر ختم ہوتی ہیں جزا اور سزا کے دلائل کے بعد بطور جملہ معترضہ آ گئی ہیں۔ ان میں پہلے منکرین کو جھڑکی دی ہے اور اس کے بعد ان کی مقابل جماعت کے انجام کا ذکر کر کے ترہیب و ترغیب کے دونوں پہلو جمع کر دیئے ہیں۔ پھر اس سے فارغ ہو کر اصل عمود کی بات (یعنی اثبات جزا و سزا) دوبارہ شروع کر دی ہے۔ اور یہاں جملہ کا جوڑ "واؤ" سے ملایا ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ اوپر جو قسمیں گذری ہیں ان میں بھی جزا و سزا کے دلائل و شواہد موجود ہیں۔ فرمایا:۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝۲۱ وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ۝۲۲ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ

أَنَّكُمْ تَنْطِقُونَ ﴿٢٣﴾

اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لئے اور خود تمہارے اندر بھی کیا تم دیکھتے نہیں؟ اور آسمان میں تمہاری روزی ہے اور وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ پس آسمان اور زمین کے پروردگار کی قسم یہ بات حق ہے جس طرح کہ تم بولتے ہو۔

۷ ۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

(از آیت ۲۰ ۔ ۲۳)

وَفِي الْأَرْضِ شروع کی قسموں سے جو بات مفہوم ہوتی ہے یہ جملہ اسی پر معطوف ہے۔ گویا کلام کا پورا سلسلہ یوں ہے کہ ہواؤں کے تصرفات اور بادلوں کی گردش میں قیامت کی دلیلیں پنہاں ہیں اور اسی طرح زمین میں اور خود تمہارے اندر بھی قیامت کی نشانیاں موجود ہیں۔ اور "للموقنین" (یقین کرنے والوں کے لئے) بالکل اسی طرح کی قید ہے جس طرح کی قید بقرہ کے شروع میں ہے۔ "هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ" (ہدایت ہے ڈرنے والوں کے لئے) اس کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ مثلاً سورہ ق میں ہے:

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ ۔ (ق: ۳۷)	اس میں یاد دہانی ہے اس شخص کے لئے جس کے پاس دل ہو یا کان لگائے متوجہ ہو کر۔

یا فرمایا:-

تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ	بصیرت اور یاد دہانی ہے ہر متوجہ
عَبْدٍ مُّنِيْبٍ (ق : ۸)	ہونے والے بندے کے لئے۔
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ	اس میں نشانی ہے اس شخص
خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ	کے لئے جو آخرت کے عذاب
(هود: ۱۰۳)	سے ڈرے۔

دوسری جگہ ہے "اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ" (نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سمجھیں) ان سب کا مطلب یہی ہے کہ یہ ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو ان سے فائدہ اٹھانا چاہیں۔ عام محاورہ میں کہتے ہیں اسفر الصبح لذی عینین (آنکھیں رکھنے والوں کے لئے صبح طلوع ہو گئی)

اس اسلوب کلام سے دو حقیقتیں واضح ہوتی ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ قدرت کے دلائل میں نہ کوئی جبر و اکراہ ہے اور نہ کوئی نقص ہے۔ جو شخص ان سے فائدہ اٹھانا چاہے اس کے لئے ان سے فائدہ اٹھانے کی راہ ہر وقت کھلی ہوئی ہے۔ اور اگر کوئی شخص ان سے فائدہ نہ اٹھانا چاہے تو یہ اس کے دماغ میں جبراً نہیں ٹھونسے جاتے۔ اگر منکر ان سے فائدہ نہیں اٹھاتے تو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ فی نفسہ ان دلائل کے اندر کوئی نقص ہے بلکہ اس کا سبب خود ان کی اپنی طبیعت کا بگاڑ ہے۔

۲۔ دوسری یہ کہ ان نشانیوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے کچھ ضروری شرائط ہیں

جن کی پابندی کئے بغیر ان سے فائدہ اٹھانا ناممکن ہے۔

مناسب ہوگا کہ اس بحث کو ہم ذرا کھولدیں۔

"موقنین" کی قید سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو ان سے استدلال کریں اور استدلال کے لئے دو باتوں پر یقین کرنا ضروری ہے۔ ایک ان مقدمات اور مسلمات پر جن پر دلیل مبنی ہوتی ہے۔ دوسری اس لازمی نتیجہ پر جو ان سے پیدا ہوتا ہے۔ پس ایک یقین نہ کرنے والا شخص دو حالتوں سے خالی نہیں ہو سکتا یا تو وہ ایک سفسطی ہے جو سرے سے مسلمات ہی کا منکر ہے تا بہ دلیل چہ رسد! یا ایک مقلد جامد ہے جو مسلمات کا تو منکر نہیں ہے لیکن ان کے ترتیب واستعمال سے جو لازمی نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے اور درحقیقت ان منکرین کا یہی وہ تضاد ہے جس پر قرآن نے جگہ جگہ "فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ" اور "فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ" وغیرہ کے الفاظ سے ان پر تعجب کیا ہے۔

پس یہاں قرآن نے "مُوْقِنِيْن" کی قید لگا کر اس اولین شرط کی طرف اشارہ کر دیا ہے جس کے بغیر کوئی انسان استدلال کی راہ سے علم نہیں حاصل کر سکتا اور جو شخص اس چیز سے خالی ہو وہ درحقیقت انسانوں میں شمار ہونے کے لائق ہے بھی نہیں۔ اس کی اصلی جگہ چوپایوں کے کسی گلہ میں ہے۔ وہ اس قابل نہیں کہ اس کو خطاب کیا جائے۔

اس کے بعد قرآن نے اس چیز کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو یقین کی اصل ہے اور اس کی تفصیل عنقریب تمہارے سامنے آئے گی۔

یہاں یہ بات بھی خیال میں رکھنے کی ہے کہ "یُوقِنُونَ" کا مفعول بہ ذکر نہیں کیا یعنی یہ نہیں بتایا کہ کس چیز پر یقین رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقصود اس کو عام رکھنا تھا تاکہ وہ تمام چیزیں اس کے تحت آسکیں جن پر یقین رکھنا چاہیئے۔ ان چیزوں میں اصل و اساس کی حیثیت توحید کو حاصل ہے پھر قیامت اور رسالت کو۔

اور یقین سے مراد محض اس عالم محسوس اور اس کے ظواہر کے وجود کا یقین نہیں ہے۔ اس یقین میں تو مومن و کافر بلکہ انسان اور بہائم سب مشترک ہیں۔ بلکہ یقین سے مراد وہ یقین ہے جو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پر غور کرنے اور ان سے استدلال کرنے سے پیدا ہوتا ہے اور یہی یقین ہے جو درحقیقت عقل کی پختگی کی دلیل ہے۔ ہم "اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ" کی تفسیر میں اس کو وضاحت سے بیان کر چکے ہیں۔

اس عموم کے باوجود موقع کلام اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یہاں سب سے پہلے آخرت کا یقین مراد ہے چنانچہ کہیں کہیں اس کی تصریح بھی ہو گئی ہے مثلاً: "وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ" اور وہ لوگ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (کیا تم دیکھتے نہیں) یہ استفہام نفرت و تعجب کے اظہار کے لئے ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس کے اندر کی نشانیاں انسان کے لئے سب سے زیادہ نمایاں، سب سے زیادہ قریب، اور سب سے زیادہ واضح ہیں۔ اگر کسی شخص کو یہ نشانیاں بھی نظر نہیں آتیں تو وہ فی الواقع اندھا ہے۔

وَفِي الْاَرْضِ... وَمَا تُوعَدُوْنَ

اس میں توحید، خدا کی پروردگاری اور اس کی حکمت کی اتنی نشانیاں جمع ہوگئی ہیں کہ وہ شمار نہیں کی جاسکتی ہیں۔ جیسا کہ فرمایا ہے:۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ — اور آسمان و زمین میں کتنی ہی نشانیاں
وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا — ہیں جن پر سے وہ گذرتے ہیں اور ان سے
وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (یوسف: ۱۰۵) — منھ پھیرے ہوئے ہوتے ہیں۔

قرآن میں اس مضمون کی آیتیں اجمال اور تفصیل کے مختلف اسلوبوں میں مختلف مقامات میں بار بار آئی ہیں۔ یہاں ان کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ سیاق کلام اور موقع و محل اشارہ کر رہا ہے کہ یہاں مراد وہ دلیلیں ہیں جن سے آخرت کا ثبوت ہوتا ہے لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ خدا کی ربوبیت اور اس کی حکمت و رحمت کی تمام نشانیاں آخرت پر یکساں دلیل ہیں۔ اس نکتہ کی وضاحت ہم کسی دوسری جگہ کر چکے ہیں۔

یہاں ایجاز کلام کا ایک خاص اسلوب بھی قابل توجہ ہے۔ ایک مقابل کے ساتھ جو بات ذکر کی گئی ہے دوسرے کے ساتھ اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ زمین کے متعلق فرمایا کہ اس میں نشانیاں ہیں مگر آسمان کی نشانیوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ علی ہذا القیاس آسمان کے ساتھ رزق اور ایک شے موعود کا ذکر فرمایا مگر زمین کے ساتھ ان چیزوں کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بسا اوقات ایک ذکر کی ہوئی بات دوسری بہت سی ایسی باتوں کی طرف اشارہ کر دیتی ہے جن کا ذکر نہیں ہوا ہے اور کسی بات کو بے ضرورت طول دینا عربی زبان کی بلاغت کے خلاف ہے۔

چونکہ دوسرے مقامات میں زمین کی نشانیوں کے ساتھ آسمان کی نشانیوں کا بھی ذکر آیا ہے اور آسمان کے رزق کے ساتھ زمین کے خزائن رزق کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ اس وجہ سے ضرورت نہیں تھی کہ یہاں بھی ساری تفصیل بیان کی جاتی۔ بلکہ بعض آیات سے تو یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ جس طرح آسمان کے اندر ہمارے لئے ایک وعدہ چھپا ہوا ہے اسی طرح زمین بھی اپنے بطن میں ایک "شئے موعود" کا حمل چھپائے ہوئے ہے۔ مثلاً :-

ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اعراف: ۱۸۷)	وہ آسمانوں اور زمین میں بھاری ہوگئی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا آسمان و زمین، دونوں اس موعود کے حمل سے بوجھل ہیں اور اس کے وجود میں آجانے کے لئے صرف اشارہ غیب کا انتظار ہے۔

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اس قسم میں آخرت کی دلیل نہاں ہے۔ یہ دلیل آسمان و زمین کی ان نشانیوں سے ظاہر ہے جو اوپر گذر چکی ہیں۔ ان نشانیوں کے بعد آسمان و زمین کے خداوند کو شہادت میں پیش کرتا ہے۔ اگر اس بات کا تعلق ماسبق سے نہ ہوتا تو یہاں تعقیب کی ف نہ لاتے۔ یہ ف اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ جملہ ماسبق سے نہایت گہرا تعلق رکھتا ہے۔ پھر "رب" کے لفظ کے اندر بھی ایک اصولی استدلال موجود ہے وہ یہ کہ آسمان و زمین اور ہمارے نفس کی ہر نشانی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی نشانیوں میں سے ہے اور قیامت کے تمام دلائل اسی ربوبیت پر مبنی ہیں۔ یہاں ہم صرف اسی اجمالی اشارہ پر بس کرتے ہیں۔ دوسری فصل میں اس کی تفصیل آئے گی۔

اِنَّهٗ لَحَقٌّ مقسم علیہ یہاں بھی وہی ہے جو سورت کے شروع میں گذر چکا ہے۔ یعنی "اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ وَاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ" اور "مَا تُوْعَدُوْنَ" کا ذکر بھی چونکہ اوپر گذر چکا ہے اس وجہ سے ضمیر کافی ہوئی۔ گویا پوری بات یوں ہوئی کہ "آسمان وزمین کے پروردگار کی قسم بے شک تمہارا اٹھایا جانا اور بدلہ پانا حق ہے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے۔"

مِثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ "مثل" چونکہ انہ والی ضمیر سے حال پڑا ہوا ہے۔ اس وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ اور عامل اس میں، نحویوں کی اصطلاح کے مطابق "شبہہ فعل" یعنی "لحق" ہے جیسے زید حسن ضاحکا۔ مطلب یہ ہوا کہ حشر ونشر اور جزا وسزا کا جو وعدہ تم سے کیا جاتا ہے، وہ ایک امر واقعی ہے، اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے، اور اس کا حال بالکل تمہارے نطق سے مشابہ ہے۔

جہاں تک نفس تاویل کا تعلق ہے، سلف اس میں بالکل متفق ہیں لیکن اس کی نحوی ترکیب کے بارہ میں اختلاف ہے۔ جو لوگ اس کو نصب میں پڑھتے ہیں ان میں سے ایک جماعت اس کو رفع کے محل میں مانتی ہے، لیکن چونکہ اس کی اضافت غیر متمکن کی طرف ہے۔ اس وجہ سے اس پر نصب کی حرکت ہے مثل یَوْمَئِذٍ۔ اور حمزہ، کسائی اور ابوبکر نے اس کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے لیکن اس سے اصل مفہوم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ اس کا مطلب سب کے نزدیک ایک ہی ہے۔

رہا تمثیل کا موقع استدلال تو اس کی تفصیل انشاء اللہ نویں فصل میں ملے گی۔

۸ ۔ آیات سابقہ سے جزاء و سزا پر استدلال

آسمان، زمین اور ہمارے نفس کے اندر جسقدر دلائل و شواہد موجود ہیں ان چاروں آیتوں نے ان سب کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آسمان و زمین اور نفس کے اندر اور پھر آسمان و زمین کے مابین عجائب قدرت و خلقت کی جو عظیم الشان نشانیاں موجود ہیں اور ان کو دست غیب نے جس طرح ایک دوسرے کے لئے ساز گار بنایا ہے، اس سے خدا کی توحید اور اس کی پروردگاری کا نہایت کھلا ہوا ثبوت ملتا ہے۔ اس نظام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس پروردگار نے اس کو بنایا ہے وہ بادشاہت، قدرت، علم، حکمت اور عدل و رحمت کی تمام اچھی صفتوں سے کمال درجہ متصف ہے اور پھر اس سے لازمی نتیجہ کے طور پر یہ بھی نکلتا ہے کہ وہ جزاء و سزا دینے والا بھی ہے۔ گویا استدلال کا پہلا زینہ یہ ہے کہ ہم خدا کی ان صفتوں تک پہنچتے ہیں جو توحید پر دلیل ہیں، پھر اس سے جزاء و سزا پر استدلال کرتے ہیں۔ اس ترتیب استدلال کی قرآن مجید نے متعدد مقامات پر وضاحت کی ہے اور ہم نے کتاب الحج[۱] میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔

پس ان آیات میں پہلے عام طور پر خدا کی پروردگاری کے آثار رحمت کی طرف

---

[۱] استاذ مرحوم کی یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہو سکی ہے۔ ممکن ہے اب اس کی اشاعت کے لئے اللہ تعالیٰ کوئی راہ کھولے۔ (مترجم)

اشارہ فرمایا ہے، پھر خاص طور پر جزا اور سزا کے دلائل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ۔ — اور آسمان میں تمہاری روزی ہے اور وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

یعنی وہ پروردگار جو تمہارے لئے آسمان و زمین سے روزی فراہم کرتا ہے، اس نے تم کو بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ اور وہ تم کو یوں ہی شتر بے مہار کی طرح نہیں چھوڑے رکھے گا۔

چنانچہ ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے:۔

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ (مومنون: ۱۱۵) — کیا تم نے خیال کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو بے مقصد بنایا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے۔

پھر اس بات کو بعد کے قول سے واضح تر کر دیا ہے۔ فرمایا:۔ •

فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنْطِقُونَ۔ — پس آسمان اور زمین کے رب کی قسم یہ بات شدنی ہے جس طرح کہ تم بولتے ہو۔

یعنی جزا اور سزا پر اس بات سے دلیل پیش کی کہ وہ آسمان و زمین کا پروردگار ہے۔ اور یہ آسمان و زمین اپنے اندر بے شمار ایسی آفاقی و انفسی دلیلیں رکھتے ہیں جن سے ربوبیت اور جزا و سزا کی شہادت ملتی ہے۔ اسی بات کو قرآن نے دوسری جگہ نہایت

واضح لفظوں میں یوں بیان کر دیا ہے :-

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ
وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ
لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۗ اَوَلَمْ يَكْفِ
بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ
فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ
رَبِّهِمْ ۗ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ
شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ......

(حم السجدۃ : ۵۳، ۵۴)

ہم دکھائیں گے ان کو اپنی نشانیاں
آفاق میں اور خود ان کے اندر یہاں
تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ یہ حق
ہے (یعنی آخرت، جیسا کہ بعد میں
بیان فرمایا ہے) کیا یہ بات کافی
نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز پر گواہ
ہے؟ (یعنی اللہ تعالیٰ کا ہر چیز پر گواہ
ہونا آخرت کے لئے کافی دلیل ہے
جیسا کہ آگے فرمایا) آگاہ، وہ
اپنے رب کی ملاقات کے بارہ میں
شبہ میں ہیں۔ آگاہ، وہ ہر چیز کا
احاطہ کئے ہوئے ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے علم و قدرت، اپنے تصرف و انتظام اور اپنی حکمت و رحمت سے تمام عالم کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ وہ ایک ایسا دن بھی لائے جس میں لوگوں کو ان کے اعمال کے مطابق جزا و سزا دے۔

یہاں ہم نے استدلال کے پہلو کی طرف صرف بالاجمال اشارہ کر دیا ہے یہ دلائل

قرآن میں اپنے اپنے محل میں نہایت تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ یہاں ان سب کے بیان کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ جہاں تک آخرت پر استدلال کا تعلق ہے موقع کے تقاضے سے ہم بحث کے بعض گوشے روشن کر دینا چاہتے ہیں۔

۹ — نطق انسانی سے معاد پر استدلال

مِثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ' کے ٹکڑے پر اگر اس کو اس کے ماقبل کے ساتھ ملا کر غور کیجئے تو مطلب یہ نکلے گا کہ تمھارا مرنے کے بعد اٹھایا جانا اور اپنے نیک و بد اعمال کا بدلہ پانا بالکل حق اور ایک امر واقعی ہے، اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے، ویسا ہی واقعی جیسا کہ تم بولتے ہو اور اس میں تم کو ذرا شبہہ نہیں ہوتا۔

اتنی بات تو بالکل کھلی ہوئی ہے لیکن اس تمثیل میں بہت سی دقیق باتیں ہیں جو غور و فکر کے بعد سامنے آتی ہیں اور ضروری ہے کہ تھوڑی دیر توقف کر کے اس پر تدبر کیا جائے۔ یہاں طبیعت میں آپ سے آپ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن نے اس موقع پر نطق کی مثال کیوں اختیار کی؟ فرمایا جس طرح تم بولتے ہو، یہ کیوں نہیں فرمایا کہ جس طرح تم دیکھتے ہو، جس طرح تم سنتے ہو، جس طرح تم کھاتے ہو، جس طرح تم پیتے ہو وغیرہ وغیرہ۔

اس سوال پر جب تم غور کرو گے تو تمھارے سامنے دو نہایت اہم حقیقتیں آئیں گی۔ ایک یہ کہ نفس کے تمام مظاہر و حالات میں سب سے زیادہ قابل یقین نطق ہی ہے۔ دوسری یہ کہ

نطق میں معاد کی دلیل نہاں ہے۔ اس اجمال کی تفصیل آگے آئے گی اور اس سے تم کو معلوم ہو گا کہ ان دونوں اعتبارات سے اس تمثیل میں ہمارے دل و دماغ کی تربیت کے لئے کیسی کیسی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔

۱۔ پہلی بات، یعنی نطق کا سب سے زیادہ قابلِ یقین ہونا، تین پہلوؤں سے ہمارے سامنے آتی ہے۔

الف ۔ نطق، نفس کے تمام مظاہر و حالات میں، نفس سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ نفس ہر بات پر فکر کے واسطہ سے متنبہ ہوتا ہے اور فکر اور نفس کے مابین کوئی واسطہ نہیں ہوتا ہے۔ اسی فکر کا دوسرا نام نطق حقیقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقل کو نفس ناطقہ بھی کہتے ہیں۔ یہ نطق جو کانوں سے سنا جاتا ہے یہ تو محض نطق حقیقی کا ظہور ہے۔ پس ظاہر ہے کہ نفس کے لئے اپنے نطق حقیقی کا علم سب سے زیادہ بدیہی اور سب سے زیادہ قابل یقین ہو گا۔

ب ۔ نطق نفس کے اندر سب سے زیادہ راسخ چیز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انسان کی فطرت کے اندر داخل اور اس کے خواص میں سے ہے۔ چنانچہ انسان کی تعریف ہی "حیوان ناطق" سے کی گئی ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے عرب جاہلیت بھی واقف تھے چنانچہ مرقش اکبر کہتا ہے ؎

هل بالديار ان تجيب صمم	لو كان حيا ناطقا كلم
کیا یہ منزلیں بہری ہیں کہ جواب نہیں دیتی ہیں	ہاں: اگر حیوان ناطق ہوتیں تو بولتیں اور جواب دیتیں

ج ۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ نفس کے تمام مظاہر و حالات میں سے نطق نے جس قدر شہادتیں اور تائیدیں اپنے اندر جمع کر رکھی ہیں اتنی تائیدیں اور شہادتیں کسی چیز کو بھی حاصل نہیں ہیں اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ کسی بات کے لئے شہادتوں اور تائیدوں کی کثرت اس کے بدیہی اور فطری ہونے سے ایک امر زائد ہے۔ اس روشنی میں نطق کی حقیقت پر غور کرو گے تو تمھیں معلوم ہوگا کہ یہ خصوصیت اس کے اندر مختلف پہلوؤں سے جمع ہوگئی ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ بولنے والا پہلے سوچتا ہے (اور درحقیقت یہ سوچنا ہی اصلی نطق ہے) پھر یہی فکر بالکل ٹھیک ٹھیک اس کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔ پھر زبان سے جو کچھ ادا ہوتا ہے اس کو کان سنتے ہیں۔ اور وہ دیکھتا ہے کہ زبان کی تعبیر اور کانوں کا سماع دونوں ایک دوسرے کے بالکل مطابق ہے۔ پھر وہ گفتگو کے مطابق مخاطب کی طرف سے اس کا جواب پاتا ہے۔ الغرض اسی طرح شہادتیں بڑھتی جاتی ہیں یہاں تک کہ لفظ لفظ بلکہ حرف حرف اس مطابقت کی شہادتوں کا انبار لگا دیتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ نفس کے وجود پر نطق سے بڑھ کر کوئی دلیل نہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دلیل میں فعل نطق کو پیش کیا ہے بجز نطق کو نہیں پیش کیا ہے۔ فرمایا ہے "مِثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ" (جس طرح کہ تم بولتے ہو) "مثل نطقکم" (تمھارے نطق کی طرح) نہیں فرمایا۔ اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ ہمارے اندر ہر چیز کا یقین درحقیقت ہمارے نطق پر یقین ہی کا نتیجہ ہے اور ہمارے تمام یقینیات اور ہمارے تمام استدلالات کی اصلی بنیاد ہمارا نطق ہی ہے۔

۲ ۔ رہی دوسری بات یعنی اس مثال میں معاد کی دلیل کا پوشیدہ ہونا تو اسکی

وضاحت سے پہلے خود تمثیل کے متعلق ایک اصولی بات ذہن میں رکھ لینی چاہیئے۔

تمثیل کبھی تو محض دعویٰ ہوتی ہے جس کی مثالیں شعراء کے کلام میں اکثر ملتی ہیں اور کبھی اس میں دلیل بھی پنہاں ہوتی ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب یا تو خود کلام کی رہنمائی سے معلوم ہوجائے یا عقل گواہی دے کہ مثل اور ممثل لہ میں کوئی ایسا قدر مشترک موجود ہے جس سے لازم آتا ہے کہ دونوں کا حکم بھی مشترک ہوگا۔ مثلاً اگر تم کسی نشہ آور چیز کے بابت کہو کہ وہ شراب کی طرح حرام ہے تو اس تمثیل میں گویا تم نے علت حرمت بتا دی۔ اسی امر مشترک کو اصطلاح میں مناط حکم کہتے ہیں۔ پھر اگر مناط حکم مثل کے مقابل میں ممثل لہ میں زیادہ قوی ہو تو اس کے لئے حکم کا ثبوت بطریق اولیٰ ہوگا جس کی واضح ترین مثال قرآن مجید میں "مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ" والی تمثیل ہے۔

اس قاعدہ کی روشنی میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نطق کی تمثیل یہاں محض دعویٰ ہی دعویٰ نہیں ہے بلکہ یہ معاد کی ایک نہایت قوی دلیل بھی ہے۔ اس دلیل کو سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ نطق انسانی اور معاد میں اشتراک اور مماثلت کے جو پہلو ہیں وہ سامنے آئیں۔ ہم یہاں بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

الف۔ سب سے پہلے غور کرنے کی چیز تو یہاں خود قسم ہے۔ قسم کے متعلق ہم اپنی کتاب الامعان فی اقسام القرآن[1] میں ثابت کرچکے ہیں کہ وہ شہادت ہے۔ پس اس موقع پر آسمان وزمین کے پروردگار کو شہادت میں پیش کرنا ورانحالیکہ پہلے گذر چکا ہے

---

[1] مصنف رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب عربی اور اردو دونوں میں شائع ہوچکی ہے۔ (مترجم)

کہ آسمان و زمین بے شمار ایسے آثار ربوبیت سے معمور ہیں جو معاد پر دلیل ہیں، گویا ان دونوں کو ان تمام آیات سمیت شہادت میں پیش کر دیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان آثار میں سے نطق اہل عقل کے نزدیک سب سے زیادہ واضح اور روشن آیت ہے جیسا کہ فرمایا ہے:۔

نَطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْ اَنْطَقَ	ہم کو اس خدا نے گویا کیا جس نے
كُلَّ شَيْءٍ۔ (حم سجدہ ۲۱:)	ہر چیز کو گویا کیا ۔

نیز فرمایا:۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ	نہیں ہے کوئی شے مگر اس کی حمد کے ساتھ
بِحَمْدِهٖ (بنی اسرائیل ۴۴)	اس کی تسبیح کرتی ہے

گویا یوں فرمایا کہ جس طرح تم بولتے ہو اسی طرح یہ پوری کائنات بول رہی ہے کہ خدا کی ذات برحق ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

ب ۔ دوسری چیز نطق کی حقیقت پر غور کرنے سے سامنے آتی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو لفظوں کو جوڑنے اور ان کو اپنے حسب منشا ادا کرنے کی قدرت عطا فرمائی ہے۔ پھر اس کو اس بات پر بھی قدرت دی ہے کہ وہ اپنے فکر اور نطق کو ٹھیک ٹھیک اعادہ کر سکے۔ بلکہ اعادہ کرنے میں وہ پہلے سے زیادہ خوبی اور صفائی کا اظہار کر سکتا ہے۔ یہ چیز انسان کے کمالات میں سے ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے جس کا اس نے خاص طور پر ذکر بھی فرمایا ہے:۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (رحمٰن: ۳-۴)	انسان کو بنایا اور اسکو نطق کی تعلیم دی

اگر انسان اپنی اس قابلیت کو دیکھے تو اس کو اس بات میں ذرا بھی شبہہ نہیں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ دنیا کو فنا ہونے کے بعد دوبارہ پیدا کر سکتا ہے، کیونکہ یہ تمام کائنات محض اس کے نطق سے وجود میں آئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو وہ کسی سامان اور آلہ کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ صرف اپنے کلمۂ (کن) سے اس کو پیدا کر دیتا ہے۔

إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝ (نحل: ۴۰)

جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ ہو جا بس ہو جاتی ہے۔

یہ تمام کائنات خدا کے ایک کلمہ سے وجود میں آئی ہے۔ اسی ایک کلمہ سے اس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے اور جب چاہے گا اسی ایک کلمہ سے ان کا اعادہ بھی فرما دے گا بلکہ دوبارہ پیدا کر دینا اس کے لئے اور بھی سہل ہے:۔

وَهُوَ الَّذِي يَبْدَءُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ۔ (روم: ۲۷)

وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر اس کا اعادہ کرے گا اور اعادہ اس کے لئے زیادہ سہل ہے۔

أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلَىٰ أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيمُ۔ إِنَّمَا أَمْرُهُ

کیا وہ ذات جس نے آسمان و زمین کو بنایا اس بات پر قادر نہیں ہو کر ان کے مثل پیدا کر دے یعنی موت کے بعد ان کو دوبارہ پیدا کر دے

إِذَآ أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔

(یٰسٓ) : ۸۱ - ۸۳

کیونکہ یہاں سیاق کلام اثبات معاد
کا ہے۔ اس مضمون کی وضاحت
دوسرے مقامات میں بھی ہوئی ہے۔
آسمان وزمین کی خلقت اس بات پر
دلیل ہے کہ وہ انسان کو دوبارہ پیدا
کر سکتا ہے۔ اس مضمون کی تصریح
ان آیات میں بھی ہے جن میں معاد کا
اثبات محض خدا کی صفت خلق وعلم
سے کیا گیا ہے۔ اس کی طرف اشارہ
یہاں بھی ہے چنانچہ فرمایا) ہاں وہی
حقیقی پیدا کرنے والا اور علم والا ہے
اس کا حکم جب وہ کسی وہ چیز کو
پیدا کرنا چاہتا ہے یہ ہے کہ وہ اسکو
کہتا ہے کہ ہوجا پس وہ ہوجاتی ہے
پس باعظمت ہے وہ ذات جس کے
ہاتھ میں ہر چیز کی قدرت ہے اور تم
اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

اسی طرح معاد کے متعلق دوسری جگہ فرمایا ہے:۔

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰہُ بِقَدَرٍ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَۃٌ کَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ	ہم نے ہر چیز کو ایک اندازے کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اور ہمارا حکم نہیں ہے مگر ایک پلک کے جھپکنے کی طرح۔
(قمر: ۴۹-۵۰)	

غرض نطق میں اس بات کی نہایت کھلی ہوئی شہادت ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو دوبارہ پیدا کرنے پر اس سے زیادہ قادر ہے جتنا ایک صاحب نطق اپنے نطق کے اعادہ پر۔ کیونکہ اعادہ نطق میں آدمی ان اسباب کا محتاج ہوتا ہے جو اس کے لئے قدرت نے مقرر کر رکھے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کسی چیز کا بھی محتاج نہیں ہوتا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ بسا اوقات انسان اپنی بعض باتیں دہرانے سے قاصر رہ جاتا ہے، وہ ان کو یا تو یک قلم بھول جاتا ہے یا ان کا کچھ حصہ بھول جاتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کسی چیز کو بھی نہیں بھولتا۔ وہ ہر چیز کو اسی طرح دوبارہ پیدا کر سکتا ہے جس طرح اس نے اس کو پہلی بار پیدا کیا۔ یہ بات مختلف اسلوبوں سے قرآن مجید میں بار بار بیان کی گئی ہے۔ مثلاً:۔

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَہٗ بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ	کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں اکٹھی نہیں کر سکیں گے؟ ہاں ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اس کے پور پور کو برابر کردیں۔
(قیامہ: ۳-۴)	

دوسری جگہ فرمایا ہے:۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ۔

(واقعہ: ۶۲)

اور تم پہلی خلقت کو تو جان ہی چکے ہو تو اس سے کیوں نہیں یاد دہانی حاصل کرتے؟

ایک اور جگہ ہے:۔

قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ. قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ۔

(یٰس: ۷۸-۷۹)

پوچھتا ہے ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا جب کہ وہ بوسیدہ ہو جائیں گی کہہ دو ان کو وہ زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی بار پیدا کیا اور وہ اپنی ہر مخلوق سے باخبر ہے۔

اثبات معاد پر یہ استدلال ان لوگوں کے جواب میں ہے جو معاد کا انکار محض اس وجہ سے کر رہے تھے کہ مرجانے اور سڑگل جانے کے بعد دوبارہ اٹھایا جانا ان کے خیال میں ایک بالکل بعید از قیاس بات تھی۔

ج ۔ نطق کی ایک ضروری خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ناطق کی طرف لوٹتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ناطق بہرا ہے اور جو بہرا ہو گا اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ گونگا بھی ہو پس نطق کی اس حقیقت کے لحاظ سے ضروری ہوا کہ یہ تمام مخلوق اپنے خالق کی طرف لوٹے کیونکہ یہ تمام خلق اللہ تعالیٰ کے کلمہ سے وجود میں آئی اور اسی کے حکم

سے قائم ہے اور ناممکن ہے کہ اس کے تصرف و اختیار سے باہر نکل سکے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے:۔

اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۚ بَلٰی وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ۚ اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۚ فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۔

(یٰس ۸۱ - ۸۳)

کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسے مثل پیدا کر دے ہاں وہی حقیقی پیدا کرنے والا اور علم والا ہے۔ جب وہ کسی چیز کو چاہتا ہے تو اس کے لئے اس کا حکم صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔ پس باعظمت ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں ہر چیز کا اختیار ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

پس یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پیدا کرے اور تمام مخلوق اس کی طرف نہ لوٹے؟ کیا وہ بولے گا اور سنے گا نہیں؟ پیدا کرے گا اور دیکھے گا نہیں وہ خلق کو پردۂ عدم سے وجود میں لائے گا تو لیکن یہ خلق اس کے قبضۂ قدرت اور احاطۂ تدبیر سے باہر نکل جائے گی اور اس کے اختیار میں کچھ باقی نہیں رہ جائے گا؟

یہ استدلال ان لوگوں کے جواب میں ہے جو معاد کو اس وجہ سے بعید سمجھتے ہیں کہ ان کے نزدیک کسی معدوم شے کا از سر نو وجود میں آنا ناممکن ہے۔ قرآن نے ان کے شبہہ کو جگہ جگہ نقل کیا ہے۔ مثلاً :-

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيدٌ ۔ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيظٌ ۔	کیا ہم جب مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے تو دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ یہ اٹھایا جانا تو بہت مستبعد ہے۔ ہم جانتے ہیں جو کچھ ان میں سے زمین کم کرتی ہے اور ہمارے پاس ایک حفاظت کرنے والی کتاب ہے۔
(ق : ۳-۴)	

دوسری جگہ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ ہے :-

قَالُوا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ۔ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَاؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَا اِلَّآ اَسَاطِيرُ الْاَوَّلِينَ ۔ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۔	کہتے ہیں کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈی بن جائیں گے تو دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ اس بات کا وعدہ ہم سے بھی کیا گیا اور اس سے پہلے ہمارے باپ دادا سے بھی کیا گیا۔ یہ تو محض اگلوں کی روایت ہے۔ کہو تو بتاؤ زمین اور جو کچھ زمین میں ہے وہ کس کا

سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ۔ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ۔ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ۔ قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ۔ . . . .

. . . .

(مومنون: ۸۴ - ۸۹)

ہے؟ اگر تم جانتے ہو۔ وہ کہیں گے اللہ کا۔ کہو پھر اس سے کیوں سبق نہیں لیتے؟ کہو بتاؤ ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا خداوند کون ہے؟ وہ جواب دیں گے کہ ان کی ملکیت تو اللہ ہی کے لئے ہے۔ کہو تو کیا تم اس سے ڈرتے نہیں؟ پوچھو کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس سے کسی کو پناہ نہیں دی جا سکتی؟ اگر تم جانتے ہو۔ کہیں گے اللہ کے ہاتھ میں۔ کہو تو پھر کہاں فریب کھا جاتے ہو۔

اس آیت میں کس تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے، وہی سب کا مالک ہے۔ سب کا پروردگار ہے، سارا کارخانہ اسی کے ہاتھ میں ہے، وہی پناہ دینے والا ہے اور وہی حفاظت کرنے والا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت کے اثبات سے دوبارہ خلق کئے جانے پر استدلال قرآن مجید

میں بہت پایا جاتا ہے۔ یہاں اس سے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

د ـــ استدلال کا چوتھا پہلو خدا کی صفات ربوبیت و عدل اور ہمارے نطق کی

مماثلت پر قائم ہے۔ قرآن مجید میں یہ استدلال مختلف طریقوں سے بیان ہوا ہے لیکن اس کو

صحیح طرح سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس بات کو یاد رکھا جائے کہ ربوبیت اور عدل

دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ربوبیت کا تصور عدل کے بغیر نہیں کیا جاسکتا چنانچہ قرآن صاف

لفظوں میں اعلان کرتا ہے کہ آسمان و زمین کا قیام عدل ہی سے ہے۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ	اگر حق ان کی خواہشوں کے تابع
لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ	بن جاتا تو آسمان و زمین اور جو
وَمَنْ فِيهِنَّ ۔ (مومنون: ۷۱)	ان کے اندر ہیں سب تباہ ہو جاتے۔

اس موقع زیر بحث میں بھی آسمان و زمین اور ان کی نشانیوں کے ذکر کے بعد

ربوبیت سے معاد پر استدلال فرمایا اور اس کے لئے نطق کی مثال اختیار کی۔ گویا استدلال

کی پوری تقریر یوں ہوئی کہ تم جو کچھ بھی کرتے دھرتے ہو اس کا آغاز ایک نطق باطنی یا

بالفاظ دیگر تفکر و تدبر سے کرتے ہو۔ اور تمھاری یہی صفت ہے جو تم کو ان تمام چیزوں

سے ممتاز کرتی ہے جو نفس ناطقہ سے محروم ہیں۔ پس جب تمھاری یہ صفت ہے تو اللہ تعالیٰ

بھی صفتِ عدل اور صفتِ حکمت سے متصف ہے۔ چنانچہ اس کائنات میں جس قدر

عجائب قدرت و صنعت تم دیکھتے ہو ان سب میں اس امر کی شہادت موجود ہے کہ یہ ایک

حکیم مدبر کی تدبیر و حکمت سے وجود میں آئی ہیں اور یہ اس امر کی ایک ناقابل انکار دلیل

ہے کہ یہ عالم ایک غایت و مقصد کے ساتھ وجود میں آیا ہے اور یہ ایک ایسے انجام پر ختم ہوگا جو سراسر رحمت و حکمت ہے۔ پھر یہیں سے یہ بات بھی نکل آتی ہے کہ ہم کو خدا نے بے مقصد نہیں بنایا ہے اس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ وہ ہر صاحب عمل کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دے اور برے اور بھلے میں امتیاز کرے۔ اس بات کو دوسرے مقامات میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ مثلاً :۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ۔ (مومنون: ۱۱۵)	تو کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تم کو بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے۔

دوسری جگہ ہے :۔

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ۔ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۔ (قلم: ۳۵-۳۶)	کیا ہم فرمانبرداروں کو نافرمانوں کی طرح کر دیں گے؟ تم کو کیا ہو گیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟

ایک اور جگہ فرمایا ہے :۔

اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ۔ (یونس: ۴)	بیشک وہ خلق کا آغاز کرتا ہے پھر اس کا اعادہ کریگا تا کہ ان لوگوں کو عدل کے ساتھ بدلہ دے جو ایمان لائے اور جنہوں نے بھلائیاں کیں۔

اسی طرح فرمایا ہے :-

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْأَرْضَ	اور ہم نے آسمان و زمین کو اور
وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۚ ذٰلِكَ	جو کچھ ان کے درمیان ہے بے مقصد
ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ	نہیں بنایا ہے۔ یہ تو ان لوگوں کا
لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ	گمان ہے جو آخرت کے منکر ہیں۔ ان
اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	کافروں کے لئے دوزخ کے سبب سے
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	ہلاکی ہو۔ کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان
كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ	لائے اور جنہوں نے بھلے کام کئے زمین
اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ	میں فساد مچانے والوں کی طرح
كَالْفُجَّارِ۔	کر دیں گے۔ کیا ہم خدا سے ڈرنے والوں
(ص : ۲۷ - ۲۸)	کو نافرمانوں کی طرح بنا دیں گے؟

یہی بات قرآن مجید میں، مختلف مقامات میں، مختلف طریقوں سے بیان ہوئی ہے اور ہر جگہ مقصد ایک ہی ہے کہ خدا کی صفات حکمت، رحمت اور عدل کا یہ لازمی تقاضا ہے سزا و جزا کا ظہور ہو۔ یہاں یہ بات اس طرح بیان فرمائی ہے کہ جس طرح تم ایک غرض و مقصد کو سامنے رکھ کر بولتے ہو اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین اور انسانوں کو ایک غایت و مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ سب اسی مقصد کی طرف برابر سفر کر رہے ہیں بلکہ یہ بات تو اس پہلی بات سے کہیں زیادہ واضح اور محکم ہے اس لئے

جس ذات کے حکم سے یہ چیزیں وجود میں آئی ہیں وہ بڑا ہی عادل اور حکیم ہے۔

یہ چند اشارات ہیں جو مذکور ہوئے، اللہ تعالیٰ کے کلام کی حکمتوں کا اس کے سوا کون احاطہ کرسکتا ہے۔

۱۰ — ان آیات کا باہمی نظم اور سابق ولاحق سے ان کا تعلق

اس جامع کلام کے اندر جو خوبصورت ترتیب پائی جاتی ہے، اور اس میں ترتیب ذالاقرب کا جو اصول ملحوظ ہے پچھلے مباحث سے ایک بڑی حد تک اس کی وضاحت ہوچکی ہے لیکن ہم اس پر مزید غور کرنا چاہتے ہیں۔

اس ٹکڑے میں وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ سے لیکر وَمَا تُوْعَدُوْنَ تک پہلے زمین کا ذکر آیا ہے۔ پھر نفس کا، پھر آسمان کا۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ نفس ایک ایسی چیز ہے جو آسمان اور زمین دونوں کے درمیان واقع ہے اور اس کے اندر دو پہلو ہیں ایک مادی، دوسرا روحانی۔ ایک پہلو سے یہ زمین کی طرف رجحان رکھتا ہے اور دوسرے پہلو سے آسمان کی طرف۔ اس کے بعد ان تینوں چیزوں کے اندر جو نشانیاں پائی جاتی ہیں ان کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ پھر فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ "(آسمان اور زمین کے پروردگار کی قسم یہ حق ہے)" فرما کر اس جامع دلیل سے پردہ اٹھایا ہے جو انسان کے دوبارہ اٹھائے جانے اور جزا وسزا کی اصلی دلیل ہے۔ یعنی خدا کی ربوبیت اور پروردگاری کی دلیل۔ پھر مِثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ "(جس طرح تم بولتے ہو)" کی تمثیل کے ذریعہ سے اس استدلال کو تقویت

پہنچائی ہے۔ وہ تمثیل اسی نفس کے صفات سے ماخوذ ہے جو ایک عالم اصغر ہونے کے اعتبار سے تمام آسمان وزمین کا ایک آئینہ ہے۔ یہ گویا وہ پہلی بات یعنی وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ کی طرف اشارہ ہوا۔ اسی طرح مثال نطق کی دی ہے جو تمام یقین واستدلال کی جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، اصل ہے۔ یہ گویا "آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ" (اس میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لئے) والے ٹکڑے کی طرف توجہ دلائی ہے۔

یہ ان آیات کا نظم آپس میں ہے۔ یہاں ان کا تعلق سابق اور لاحق سے تو اوپر ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ یہ پورا ٹکڑا وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ سے لیکر مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ تک انہی دلائل سے تعلق رکھتا ہے جو سورہ کے شروع سے چلے آرہے ہیں۔ ابتدائے سورہ سے یہاں تک تمام استدلال فطری چیزوں سے کیا گیا ہے۔ پہلے ہوا، ابر، زمین، آسمان اور نفس کو شہادت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد تاریخی واقعات مزید ثبوت کے طور پر لائے گئے ہیں۔ اس قسم کے نظم کی مثال سورہ شمس میں بھی موجود ہے۔ اور اسکی وضاحت مذکورہ سورہ کی تفسیر میں ملے گی۔

قرآن مجید میں فطرت کے دلائل کو تاریخی واقعات سے قوت پہنچانے کا جو عام اسلوب اکثر جگہ پایا جاتا ہے اسکی ایک مثال یہاں بھی موجود ہے۔ یہاں بھی جزا و سزا کے قانون کو ثابت کرنے کے لئے بعض مشہور تاریخی واقعات بیان کئے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ سے مخاطب کو دنیاوی عذاب سے بھی ڈرایا جائے اور ساتھ ہی ان کو ایک بڑے روز جزا کی دلیل کی حیثیت سے بھی پیش کیا جائے، جیسا کہ فرمایا ہے :-

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۭ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ۔
(ھود: ۱۰۲-۱۰۳)

اور تیرے خداوند کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے جب کہ وہ بستیوں کو پکڑتا ہے ان کے ظلم کی حالت میں بے شک اس کی پکڑ نہایت دردناک اور سخت ہوتی ہے۔ اس کے اندر دلیل ہے ان لوگوں کے لئے جو آخرت کے عذاب سے ڈریں۔

پھر موقع کلام کی بلاغت کی رعایت سے تاریخی واقعات میں سے صرف وہ واقعات یہاں بطور شہادت کے پیش کئے ہیں جو ابتدائے سورہ کی ابر اور ہوا کی قسموں سے نہایت گہری مناسبت رکھتے ہیں۔ اس کی تفصیل ان واقعات کے بعد بیان ہوگی۔

آگے ارشاد ہوتا ہے:۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝۲۴
اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝۲۵
فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَاۗءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ۝۲۶ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ
قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝۲۷ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۭ
وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝۲۸ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ
وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ۝۲۹ قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ

إِنَّهُ هُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ ۝٣٠ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ۝٣١ قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ مُّجْرِمِينَ ۝٣٢ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن طِينٍ ۝٣٣ مُّسَوَّمَةً عِندَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِينَ ۝٣٤ فَأَخْرَجْنَا مَن كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝٣٥ فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ ۝٣٦ وَتَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِّلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ۝٣٧

کیا تم نے ابراہیم کے معزز مہمانوں کی سرگذشت سنی ؟ جب وہ اس کے پاس آئے تو کہا سلام ، اس نے بھی کہا سلام ، (اور دل میں کہا) یہ اجنبی لوگ ہیں۔ پھر وہ مڑا اپنے گھر کو اور لایا ان کے لئے فربہ بچھڑے کا بھنا ہوا گوشت اور اس کو ان کے سامنے پیش کیا۔ پھر بولا کہ آپ لوگ کھاتے نہیں ؟ پس اس نے ان سے اندیشہ محسوس کیا۔ انھوں نے اس سے کہا تم اندیشہ ناک نہ ہو اور اس کو ایک فرزند دانشمند کی خوشخبری دی۔ پھر اس کی بیوی حیران ہو کر متوجہ ہوئی ، اس نے اپنا ماتھا پیٹا اور بولی کیا ایک بوڑھیا بانجھ اب جنے گی! وہ بولے کہ ایسا ہی کہا ہے تیرے خداوند نے۔ وہ حکمت والا اور علم والا ہے۔ اس نے پوچھا اے فرستادو، تمھارے سامنے اس وقت کیا مہم ہے ؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں ، تاکہ ان کے اوپر سنگِ گل کی بارش کریں جو تیرے رب کے پاس حدود سے تجاوز کرنے والوں کے لئے

نشان لگائے ہوئے ہیں۔ پھر وہاں جتنے اہل ایمان تھے ان کو ہم نے وہاں سے نکال لیا۔ تو ہم نے بجز مسلمانوں کے ایک گھر کے اور کسی کو وہاں مسلمان نہ پایا۔ اور ہم نے اس سرزمین میں ایک نشانی چھوڑی ان لوگوں کے لئے جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں)

۱۱ ۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

(از آیت ۲۴ - ۳۷)

اگرچہ یہ قصہ سورۂ ھود میں گذر چکا ہے اور اس کی بہت سی ضروری تفصیلات وہاں بیان ہو چکی ہیں تاہم یہاں بھی ہم بعض مناسب مقام باتوں کی وضاحت کریں گے۔

اَلْمُكْرَمِيْنَ اس لفظ سے اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ خوش دلی اور خندہ جبینی کے ساتھ مہمان کا خیر مقدم اور اس کی میزبانی میزبان کے اولین فرائض میں سے ہے اور یہ کہ حضرت ابراہیمؑ ایک مہمان نواز اور فیاض شخص تھے۔

قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ اجنبی لوگ ـــــ یہ الفاظ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے دل میں کہے اور ان کے کہنے کی وجہ یہ ہوئی کہ یہ فرشتے صالحین کے بھیس میں آئے تھے۔ اور صالحین اس زمانہ میں اول تو بہت تھوڑے تھے اور جو تھے بھی وہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھیوں میں سے تھے۔ اس وجہ سے حضرت ابراہیمؑ

کو تعجب ہوا کہ یہ لوگ کہاں سے نکل آئے!

فَرَاغَ اِلٰی اَھْلِہٖ

اور وہ اپنے گھر والوں کی طرف مڑا — اس میں 'رَاغَ' کے لفظ سے اس بات کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ وہ مہمانوں کی نظر سے بچ کے میزبانی کے اہتمام کے لئے گھر کی طرف گئے جس سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نہایت کریم النفس اور بلند اخلاق آدمی تھے کیونکہ ایک کریم النفس اور بلند اخلاق آدمی ہی کی یہ شان ہوتی ہے کہ وہ میزبانی کا اہتمام مہمان کی نگاہوں سے بچ کے کرتا ہے تاکہ اس کی طبیعت پر گراں نہ گذرے۔ اور اس طرح کے معاملات میں احسان جتانے کی جو ممانعت اور اخفا کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی جو تاکید ہے اس کے لحاظ سے بھی یہی رویہ صحیح تھا۔

اَلَا تَاْکُلُوْنَ

آپ لوگ کھاتے نہیں — کھانا ان کے سامنے پیش کرنے کے بعد جب انھوں نے دیکھا کہ یہ لوگ کھا نہیں رہے ہیں تب انھوں نے یہ نہایت محبت کے ساتھ ان کو کھانے کی دعوت دی ہے۔

فَاَوْجَسَ مِنْھُمْ خِیْفَۃً

پس اس نے ان سے ڈر محسوس کیا۔ 'اَوْجَسَ' کا لفظ دل میں کسی چیز کے محسوس کرنے کے لئے آتا ہے۔ خاص کر خوف کے محسوس کرنے کے لئے عربی زبان میں اس کا استعمال عام ہے۔ 'خِیْفَۃً' یعنی ذرا سا خوف۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب مہمان کھانا نہ کھانے پر مصر ہے تو حضرت ابراہیمؑ کے دل کے اندر قدرتاً ان کی عظمت بھی بڑھی اور

وہ اجنبیت بھی کچھ زیادہ ہوئی جو حضرت ابراہیمؑ نے شروع میں محسوس کی تھی۔ اس چیز کا اشارہ سورہ ھود میں بھی ہے :۔

فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَهُمْ	جب اس نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ
لَا تَصِلُ اِلَیْهِ نَكِرَهُمْ	کھانے کی طرف نہیں بڑھ رہے
وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً ؕ	ہیں تو ان کو اس نے بے گانہ
(ھود: ۷۰)	محسوس کیا اور ان سے دل
	ہی دل میں ڈرا۔

بَشَّرُوْهُ | اس کو خوشخبری دی — یہ خوشخبری بلند آواز سے دی گئی یہاں تک کہ حضرت سارہ نے بھی سن لی جو قریب ہی کھڑی تھیں (سورہ ھود میں ہے :۔

وَامْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ	اور اس کی بیوی پاس ہی کھڑی
فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا	تھی پس وہ ہنسی پس ہم نے اس کو
بِاِسْحٰقَ ۔ (ھود: ۷۱)	اسحاق کی خوشخبری دی۔

چونکہ یہ بشارت حضرت سارہ کے لئے براہ راست نہیں بلکہ حضرت ابراہیمؑ علیہ السّلام کے واسطے سے تھی اس وجہ سے سورۂ ھود والی آیت میں فعل بشارت کی نسبت فرشتوں کی طرف نہیں کی گئی ہے کیونکہ انھوں نے حضرت سارہ سے ابتداءً کوئی گفتگو نہیں کی۔

عَلِیْمٍ | بیٹے کے لئے علیم کی صفت لانے سے یہ حقیقت واضح ہو رہی ہے کہ بیٹے کی

بشارت اس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتی جب تک اس کے صاحب صلاحیت ہونے کی بشارت نہ دی جائے، چنانچہ علیم کے لفظ نے یہ کمی پوری کر دی۔ اور بشارت کے لئے علم کی صفت تنہا بالکل کافی ہو کیونکہ علم ہی تمام اعلیٰ صفتوں اور تمام کمالات کا سرچشمہ ہے۔

فَاَقْبَلَتْ یعنی بشارت سننے کے بعد وہ اس تعجب کے اظہار کے لئے آگے بڑھیں جو ان کے دل میں پیدا ہوا۔ چنانچہ بعد کے الفاظ اس کی وضاحت کر رہے ہیں۔

فِیْ صَرَّۃٍ تعجب اور حیرت کی حالت میں۔ عربی زبان میں محاورہ ہے صَرَّتِ الفرسُ اُذُنیہ (گھوڑے نے اپنی کنوتیاں کھڑی کیں) یہ استعمال اسی محاورہ سے ماخوذ ہے۔ اس حیرانی کی وجہ وہ عجیب بات ہے جس کی بشارت فرشتوں نے دی۔

فَصَكَّتْ وَجْهَهَا یعنی حضرت سارہ نے اپنا ہاتھ اپنی پیشانی پہ مارا۔ یہ عورتوں کے کسی بات پہ تعجب کرنے اور حیرت ظاہر کرنے کا طریقہ ہے۔ سورہ ہود میں بھی اس کا ذکر ہے:۔

قَالَتْ يَا وَيْلَتٰىٓ ءَاَلِدُ	وہ بولی ہائے میری کم بختی کیا اب
وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ	میں جنوں گی اور میں بڑھیا ہو گئی
شَيْخًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ	ہوں اور میرا شوہر بھی بوڑھا ہو چکا ہے
عَجِيْبٌ۔ (ھود: ۷۲)	یہ تو ایک نہایت عجیب بات ہوئی۔

حِجَارَۃً مِّنْ طِيْنٍ | یعنی کنکر۔ اس کو سجیل بھی کہتے ہیں جو دراصل سنگ گل سے معرب ہے۔ سورہ ہود میں بھی اس کا ذکر آیا ہے:

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ۔ (ھود: ۸۲) | اور ہم نے ان پر سنگ گل کی بارش کی۔

یہاں سنگ گل کے معنی کی وضاحت کر دی ہے۔ اور قرآن مجید کا یہ قاعدہ ہے کہ جو چیز ایک جگہ مبہم ہوتی ہے دوسری جگہ وہ اس کی وضاحت کر دیتا ہے۔

مُسَوَّمَةً | ترکیب نحوی کے لحاظ سے یہ یا تو حجارۃً کی صفت ہے یا اس سے حال پڑا ہوا ہے۔ رہے اس کے معنی تو اخفش نے لفظ "مُسَوَّمِيْنَ" کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یا تو اس کے معنی نشان زدہ کے ہیں یا چھوڑے ہوئے کے۔ اس دوسرے معنی کے لئے عربی زبان میں محاورہ ہے سَوَّمَ فِيْهَا الْخَيْلَ (گھوڑوں کو اس میں چھوڑ دیا)۔ ابوزید کا قول ہے کہ "الخیل المسومۃ سے مراد وہ گھوڑے ہیں جو شہسواروں کے ساتھ چھوٹے جائیں"۔ پس اگر علامت کا مفہوم لیا جائے تب تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ پتھر نشان زدہ اور معین کئے ہوئے ہیں، گویا ان میں سے ہر ایک کے اوپر خود خدا نے ان لوگوں کے نام لکھ رکھے ہیں جن پر یہ نازل ہونے والے ہیں۔ اور اگر چھوڑنے کا مفہوم لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس حدود الٰہی سے تجاوز کرنے والوں کے لئے تیار کئے ہوئے رکھے ہیں۔ سورہ ہود میں بھی اس مضمون کی طرف اشارہ ہے:۔

مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ۔ | تہ بہ تہ سنگ گل کے ڈھیر تیرے

مُسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ، رب کے پاس تیار کئے رکھے

وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ہیں اور یہ ظالموں سے دور

بِبَعِيْدٍ، (ھود: ۸۲-۸۳) نہیں ہیں۔

اور مقصد ان دونوں تاویلوں کا ایک ہی ہے۔

لِلْمُسْرِفِيْنَ | اسراف کے معنی مقررہ حد سے آگے بڑھنے کے ہیں۔ یہ لفظ چھوٹے بڑے ہر قسم کے گناہوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اس کا استعمال اسی عمومیت کے ساتھ ہوا ہے:-

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ کہدو اے میرے وہ بندو جنھوں

اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ، نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے، اللہ

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ کی رحمت سے مایوس نہ ہو،

اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو

جَمِيْعًا (زمر: ۵۳) بخش دیتا ہے

اس قسم کے عام اور وسیع مفہوم رکھنے والے الفاظ کے معنی کا تعین قرینہ سے ہوا کرتا ہے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اس لفظ سے بطریق کنایہ وہ برائی مراد ہے۔ جس میں قوم لوط مبتلا تھی۔

فَاَخْرَجْنَا سے اَلِيْم تک ملائکہ کا قول نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ فرشتے جب ابراہیم علیہ السّلام کے پاس سے ہو کر حضرت لوط علیہ السّلام کے پاس پہنچے تو سب سے

پہلے انہوں نے حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کو اس بستی سے نکالا تاکہ یہ لوگ اس عذاب سے محفوظ رہیں جو قوم لوط پر نازل ہونے والا تھا۔ اور اس کے اندر فیھا کا جو لفظ ہے وہی اشارہ کر رہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ فرشتوں کا نہیں ہے۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

فِيهَا اگرچہ ضمیر کا مرجع یہاں مذکور نہیں ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے یہاں سرزمین قوم لوط اور ان کی الٹی ہوئی بستی مراد ہے۔ "ارض" ایک ایسا لفظ ہے کہ جہاں قرینہ ہو وہاں صرف اس کی ضمیر لا دیتے ہیں اگرچہ لفظ پہلے مذکور نہ ہو۔ اس مقام پر قرینہ یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے، اور یہ اوپر کی آیت "وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ" سے مربوط و متعلق ہے۔ زمین میں جن نشانیوں کا حوالہ دیا ہے۔ اس سرگذشت کے ذریعہ سے انہی نشانیوں کی تفصیل کی ہے۔ اوپر ہم کہیں یہ ذکر کر آئے ہیں کہ ان بستیوں کی نشانیاں عربوں کے سامنے بالکل واضح تھیں۔ کیونکہ یہ ان کی تجارتی شاہراہوں پر واقع تھیں جن سے ان کو اکثر گذرنے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔ بعد والی آیت میں اسکی تصریح بھی فرما دی ہے۔ وَلَقَدْ تَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِّلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ (اور ہم نے اس سرزمین میں ایک نشانی چھوڑی ان لوگوں کے لئے جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں) یعنی اس بات کی نشانی کہ جزا ہو کے رہے گی۔

مِنَ الْمُسْلِمِينَ اس بستی میں حضرت لوط علیہ السّلام کے گھر کے سوا اور کوئی گھرانا مسلمان نہیں تھا۔ حضرت لوط علیہ السّلام کے گھر والوں

میں سے جو مومن تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو نجات دی ۔ البتہ حضرت لوطؑ کی بیوی عذاب میں گرفتار ہوئی کیونکہ یہ ایمان نہیں لائی تھی ۔ اس کا تعلق حضرت لوطؑ کے اہل بیت کے ساتھ محض ظاہری تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقام پر مسلمین کا لفظ لایا گیا ۔

۱۲ ۔ اس سرگذشت کا تعلق آگے اور پیچھے سے

اوپر کے ٹکڑے میں یہ ذکر ہوا تھا کہ یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں ۔ چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ زمین میں خدا کی رحمت و پروردگاری کی بھی نشانیاں ہیں کیونکہ اسی کے اندر سے وہ اپنے بندوں کو رزق عطا فرماتا ہے اور اس میں اس کے قہر و غضب کی بھی نشانیاں ہیں کیونکہ اس نے مجرموں پر جو عذاب نازل کئے ہیں اس کے آثار جیبہ جیبہ پر موجود ہیں ۔

نیز اوپر کی آیات میں یہ بھی فرمایا تھا کہ آسمان کے اندر بندوں کے لئے روزی بھی ہے اور وہ عذاب بھی ہے جس کی خبر دی جا رہی ہے ۔ چنانچہ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السّلام کی اس مشترک سرگذشت میں رحمت و بشارت اور عذاب و انذار دونوں چیزیں جمع کر دی گئی ہیں ۔ وہی فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے لئے بشارت لیکر آتے ہیں اور وہی قوم لوط کے لئے عذاب لے کر ۔ اس پہلو سے دیکھئے تو یہ سرگذشت "وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ" اور "وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ" میں جو دعوے کئے گئے ہیں ، یہ ان دونوں دعوؤں کا ثبوت فراہم کر رہی ہے ۔ اور قرآن نے اس ٹکڑے کے خاتمہ پر

"وَتَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِّلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ" کہہ کر نیز "فِيهَا" کے لفظ کے ذریعہ، جیسا کہ ہم نے اوپر کہا، ماسبق سے اس کو متعلق کر کے ان کے باہمی تعلق کو بالکل واضح کر دیا ہے۔

علاوہ ازیں اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السّلام وغیرہ کی جو سرگذشتیں بطور ثبوت وشہادت کے پیش کی ہیں ان کو یہاں حرف عطف کے ذریعہ سے ماسبق سے جوڑا ہے۔ فرمایا "وَفِي مُوسَىٰ الآیۃ"۔ (اور موسیٰ کی سرگذشت میں نشانی ہے) اس سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مقصود یہ بتانا ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰؑ کی سرگذشت میں نشانی ہے اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور ان کے مہمانوں کے واقعہ اور قوم لوط کے عذاب میں بھی خدا کی رحمت اور اس کے غضب کی نشانی ہے۔ نیز اس قصہ میں اور اس کے بعد کے قصوں میں اس حقیقت کی تمثیل ہے جو سورہ کے شروع میں بیان ہوئی ہے۔ اس کی تفصیل آگے ملے گی۔ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ کی سرگذشت سے ملتی جلتی دوسری سرگذشتیں بیان کیں۔ فرمایا :-

وَفِي مُوسَىٰ إِذْ أَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ۝٣٨ فَتَوَلَّىٰ بِرُكْنِهِ وَقَالَ سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ ۝٣٩ فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيمٌ ۝٤٠ وَفِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ ۝٤١ مَا تَذَرُ مِن شَيْءٍ أَتَتْ عَلَيْهِ إِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيمِ ۝٤٢ وَفِي ثَمُودَ إِذْ قِيلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوا حَتَّىٰ حِينٍ ۝٤٣

فَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ وَهُمْ يَنظُرُونَ ﴿٤٤﴾ فَمَا اسْتَطَاعُوا مِن قِيَامٍ وَمَا كَانُوا مُنتَصِرِينَ ﴿٤٥﴾ وَقَوْمَ نُوحٍ مِّن قَبْلُ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ ﴿٤٦﴾

اور موسیٰ کی سرگذشت میں بھی نشانی ہے جب کہ ہم نے اس کو فرعون کے پاس بھیجا نہایت واضح سند کے ساتھ۔ تو اس نے گھمنڈ کے ساتھ منہ موڑا اور بولا کہ یہ تو جادوگر ہے یا خبطی۔ تو ہم نے اس کو اور اس کی فوج کو پکڑ لیا اور ان کو پھینک دیا سمندر میں اور اس کے لئے وہ خود سزاوار ملامت تھا۔ اور عاد کی سرگذشت میں بھی نشانی ہے جب کہ ہم نے ان پر باد خشک چلا دی۔ وہ نہ چھوڑتی کسی چیز کو جس پر سے گذرتی مگر کر دیتی اس کو ریزہ ریزہ اور ثمود کے واقعہ میں بھی عبرت ہے جب کہ ان سے کہا گیا کہ تھوڑی مدت کے لئے اور عیش کر لو۔ تو انھوں نے سرکشی سے اپنے رب کے حکم سے اعراض کیا تو ان کو پکڑ لیا کڑاک نے اور وہ دیکھتے رہے۔ پھر نہ وہ اٹھ ہی سکے اور نہ اپنا بچاؤ ہی کر سکے۔ اور قوم نوح کو بھی ہم نے اس سے پہلے پکڑا۔ یہ لوگ بھی نافرمان تھے۔

۱۳۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

(۳۸ - ۴۶)

فِیْ مُوْسٰی | یعنی جس طرح حضرت ابراہیمؑ کی سرگذشت میں اللہ تعالیٰ کے انتقام

اور اس کی   ت کی نشانیاں ہیں اسی طرح حضرت موسیٰؑ کے ان واقعات کے اندر بھی
خدا کی تائید اور اس کے عذاب کی نشانیاں ہیں جو فرعون کے ساتھ پیش آئے ہیں چنانچہ
سورہ شعراء میں اس کی تصریح بھی فرمائی ہے :-

وَاَنْجَیْنَا مُوْسٰی وَمَنْ مَّعَهٗ	اور ہم نے موسیٰ اور اس کے سارے
اَجْمَعِیْنَ ـ ثُمَّ اَغْرَقْنَا	ساتھیوں کو نجات دی۔ پھر دوسروں
الْاٰخَرِیْنَ ـ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ	کو غرق کر دیا۔ بیشک اس واقعہ کے
لَاٰیَةً ۔ (شعراء : ۶۵-۶۶)	اندر بہت بڑی نشانی ہے۔

بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ یعنی قوت اور کھلے ہوئے غلبہ کے ساتھ — سُلطان کا لفظ ان ساری چیزوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو از قبیل دلائل نبوت اور از قسم غلبہ و کامیابی و رعب و ہیبت عطا فرمائی تھیں۔ اور لفظ مبین کے ساتھ اس کی صفت اس جامع مفہوم کی مزید تائید کرتی ہے۔ اس معنی کی وضاحت قرآن مجید کی دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً :-

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ	فرمایا ہم تیرے بھائی کے ذریعہ سے
بِاَخِیْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا	تیرے بازو کو قوی کریں گے اور
فَلَا یَصِلُوْنَ اِلَیْكُمَا بِاٰیٰتِنَا	تم دونوں کو غلبہ عطا کریں گے تو
اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ	وہ تم تک نہ پہنچ پائیں گے۔ ہماری

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوسٰی بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ الاٰیہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (قصص : ۳۵-۳۶)

نشانیوں کے ذریعہ سے تم اور تمہارے پیرو ہی غالب رہیں گے۔ پس جب موسیٰ ان کے پاس آیا ہماری کھلی ہوئی نشانیاں لے کر۔

دوسری جگہ ہے : ۔

فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ۔ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (شعراء : ۱۵-۱۶)

پس ہماری نشانیوں کے ساتھ جاؤ ، ہم تمہارے ساتھ سننے والے ہوں گے ۔ پس فرعون کے پاس پہونچو اور کہو کہ ہم رب العالمین کے رسول ہیں ۔

پھر اس کے کچھ ہی بعد ارشاد ہوتا ہے : ۔

قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ۔ قَالَ فَاْتِ بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۔ (شعراء : ۳۰)

کہا گیا اگر میں تمہارے پاس ایک کھلی ہوئی چیز لے کر آیا ہوں تو بھی ؟ بولا لاؤ اگر تم سچے ہو ۔

فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ

یعنی تکبر اور نفرت کے ساتھ اس نے منہ موڑا ۔ رکن کے معنی یہاں مونڈھے کے ہیں اور "ب" سے یہاں تعدی کا

مفہوم پیدا ہو رہا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ ہے:۔

وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ	اور جب ہم انسان پر اپنا فضل
أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِ ۔	کرتے ہیں تو وہ اعراض کرتا ہے
(بنی اسرائیل: ۸۳)	اور گھمنڈ سے منھ موڑتا ہے۔

فرعون اور اس کی قوم کے اس غرور و گھمنڈ کی تصریح ایک دوسری جگہ بھی ہے:۔

فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ آيَاتُنَا	پس جب ان کے پاس ہماری
مُبْصِرَةً قَالُوا هَٰذَا	روشن نشانیاں آئیں تو انھوں نے
سِحْرٌ مُبِينٌ ۔ وَجَحَدُوا	کہا کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے اور
بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ	اور انھوں نے ظلم اور گھمنڈ کے
ظُلْمًا وَعُلُوًّا	سبب سے ان کا انکار کیا حالانکہ ان کے
(نمل: ۱۳-۱۴)	دلوں کو ان کا اقرار تھا۔

یعنی آیتیں بالکل واضح اور کھلی ہوئی تھیں۔ اس لئے ان کا انکار کسی شک کی وجہ سے نہ تھا بلکہ استکبار اور ظلم و سرکشی کی بنا پر تھا۔

مُلِيمٌ | 'الام' کے معنی ہیں کسی ایسے فعل کا ارتکاب جس پر ایک شخص سزاوار ملامت قرار پائے۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ اس وقت اس کی بدبختی ظاہر ہوگئی اور ہر سننے والا اس کے اس انجام پر خود اسی کو مستحق ملامت گردانتا تھا۔

اَلرِّيحَ الْعَقِيمَ | یعنی وہ ہوا جو نہ بارش لائے اور نہ کوئی اور نفع پہنچائے۔

عربی میں جس طرح بارش لانے والی ہواؤں کے لئے 'لواقح' (بارآور کرنے والی) کی صفت لاتے ہیں۔ اس طرح مضر ہوا کے لئے 'عقیم' کی (بانجھ) صفت استعمال ہے اور اس سے مراد سرما کی ٹھنڈی اور خشک ہوا ہوتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے: -

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي اَيَّامٍ نَحِسَاتٍ (حم السجدۃ: ۱۶)	پس ہم نے ان کے اوپر ہوائے تند مسلط کر دی نحوست (سرما) کے دنوں میں۔

اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

كَالرَّمِيمِ 'رمیم'، رسی، لکڑی اور ہڈی وغیرہ کے بوسیدہ ٹکڑوں اور ریزوں کو کہتے ہیں۔ سرد ہوا کی یہ خاصیت ہے کہ وہ اپنی ٹھنڈک اور خشکی کے سبب چیزوں کی قوت اور ان کی تازگی اور زندگی کو ختم کرتی ہے اور تند ہوا ہر چیز کو توڑ پھوڑ کے بالکل خس و خاشاک کے مانند بنا دیتی ہے۔ اسی کے مشابہ مضمون دوسری جگہ ہے: -

اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ۔ تَنْزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ۔ (قمر: ۱۹-۲۰)	ہم نے ان کے اوپر باد صرصر چلا دی، قائم رہنے والی نحوست کے زمانہ میں، جو لوگوں کو اس طرح اکھاڑ پھینکتی تھی گویا وہ کھجور کے کھوکھلے تنوں کے بوتے تھے۔

تَمَتَّعُوْا حَتّٰی حِیْنٍ قوم ثمود کے سرکشوں نے جب اونٹنی کی کوچیں کاٹ دیں تو ان کے نبی حضرت صالح علیہ السلام کے ذریعے ان کو یہ دھمکی دی گئی کہ اب ان کے لئے زیادہ مہلت باقی نہیں رہی ہے تین دن کے بعد ان پر عذاب آجائیگا۔ سورۂ ہود میں ہے :۔

فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا	تو انھوں نے اس کی کوچیں کاٹ
فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ	دیں تو اس نے کہلا بھیجا کہ گھروں
ذٰلِكَ وَعْدٌ غَیْرُ مَكْذُوْبٍ	میں تین دن اور عیش کر لو۔ یہ
(ھود : ۶۵)	وعدہ جھوٹا نہ ہوگا۔

فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ عتو، کے معنی نافرمانی کرنے اور گھمنڈ کرنے کے ہیں اور جب 'عن' کے ساتھ اس کا صلہ آتا ہے تو اس کے اندر گھمنڈ کے ساتھ انکار کرنے اور اعراض کرنے کے معنی بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

اَلصّٰعِقَةُ اس کی قرأت الف کے ساتھ ہے اور اس کے معنی ڈانٹ اور چیخ کے ہیں۔ سورہ ہود میں ان کی جو سرگذشت بیان ہوئی ہے اس میں صیحہ (ڈانٹ) کا لفظ ہے۔ "وَاَخَذَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ" (اور جن لوگوں نے ظلم کیا ان کو ڈانٹ نے پکڑ لیا) بعض لوگوں نے اس کو الف کے بغیر بھی پڑھا ہے۔ ان لوگوں نے گویا اسی لفظ کی تفسیر کر دی ہے کیونکہ اس صورت میں اس کے معنی بے ہوشی کے ہوں گے اور یہ بیہوشی اسی ڈانٹ کی شدت کا نتیجہ تھی

جیسا کہ بعد کی تفصیل سے واضح ہے۔

وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اس میں کئی مفہوم پوشیدہ ہیں :۔

ایک تو یہ کہ یہ عذاب کھلم کھلا آیا اور یہ لوگ اس کو دیکھتے رہے اس کے اندر کوئی شک کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ دوسری جگہ ان کی سرگزشت کے سلسلہ میں فرمایا گیا ہے :۔

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَاۗءً (مومنون: ۴۱)	تو ان کو ڈانٹ نے شدنی میں پکڑ لیا، پس ہم نے ان کو جھاگ کے مانند (کھوکھلا) کر دیا۔

اس مفہوم کے لئے نظیر قرآن کی یہ آیت ہے :۔

وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (بقرہ: ۵۰)	اور ہم نے آل فرعون کو غرق کر دیا اور تم دیکھتے رہے۔

اس مفہوم کی نظیریں بہت ہیں۔

دوسرا یہ کہ یہ عذاب آناً فاناً نمودار ہوا اور لوگوں کو ذرا بھی مہلت نہ مل سکی۔ جیسا کہ فرمایا ہے :۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ	ہم نے ان کے اوپر ایک ڈانٹ بھیجی تو وہ باڑے والے کے باڑے کی خشک اور ریزہ ریزہ لکڑیوں

(قصص : ۳۱) کے مانند ہو گئے۔

تیسرا یہ کہ یہ بالکل حیران و سراسیمہ رہ گئے، کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں، بعد کے بیان سے اس کی وضاحت ہو رہی ہے۔

فَمَا اسْتَطَاعُوا مِنْ قِيَامٍ	یعنی جب انھوں نے آسمان سے کڑاک سنی تو ان پر دہشت اور کپکپی طاری ہو گئی

اور وہ کھڑے نہ رہ سکے بلکہ زمین پر گر پڑے جیسا کہ سورہ اعراف میں ان کی حالت بیان ہوئی ہے :-

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ — پس ان کو کپکپی نے آ پکڑا پس

فَاَصْبَحُوا فِيْ دَارِهِمْ — وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ

جٰثِمِيْنَ (اعراف : ۷۸) — پڑے رہ گئے۔

یعنی کپکپی کے سبب سے وہ زمین سے چمٹ گئے اور پھر اسی حالت میں ختم ہو گئے

مُنْتَصِرِيْنَ	یعنی وہ اپنی مدافعت نہ کر سکے۔ یہ لفظ بالکل اسی معنی میں امرؤالقیس نے اپنے ایک شعر میں استعمال کیا ہے ؎

فانشب اظفارہ فی النسا — فقلت هبلت الا انتصر

(کتے نے اس نیل گاؤ کی ران میں اپنے پنجے گاڑ دیئے، پھر میں نے اس سے کہا کم بخت اب تو اپنی مدافعت کر)

اوپر یہ جو فرمایا تھا کہ وہ کھڑے نہ رہ سکے تو اس لفظ سے اس کی مزید وضاحت ہو گئی

وَقَوْمَ نُوْحٍ اس عطف نے اس اصلی مفہوم سے پردہ اٹھادیا ہے جو ان تمام سرگذشتوں کے اندر مضمر تھا، یعنی یہ مضمون کہ ہم نے ان تمام قوموں کو پکڑا اور ان ہی کی طرح ان سے پہلے ہم نے نوح کی قوم کو پکڑا۔ اس مفہوم کی تصریح فرعون کی سرگذشت میں "فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ" کے الفاظ میں موجود ہیں۔ اس اسلوب کلام کی نظیریں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ مثلاً فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ وَعَادًا وَّثَمُوْدَا۔ پھر اسی سلسلہ میں فرمایا۔[1] "وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ" اس کے بعد فرمایا "فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْبِهٖ" اسی کے مشابہ یہ آیت بھی ہے:۔ "وَاَنَّهٗ اَهْلَكَ عَادَنِ الْاُوْلٰى وَثَمُوْدَ فَمَآ اَبْقٰى وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ۔"[2] یعنی اَهْلَكَ قَوْمَ نُوْحٍ۔ بالکل یہی اسلوب زیر بحث آیت میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اور اَخَذَ اور اَهْلَكَ کے الفاظ میں کچھ ایسا فرق نہیں ہے۔

۱۳۔ ابتدائے سورہ کی قسموں سے ان سرگذشتوں کے تعلق کی ایک مخصوص نوعیت

قوم لوط، فرعون، عاد، ثمود اور قوم نوح کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آیا ہے کہیں مفصل کہیں مجمل۔ اسلوب ہر جگہ بدلا ہوا ہے تاکہ بے فائدہ تکرار کا عیب کلام میں کہیں نہ پیدا ہونے پائے۔ ایجاز و اختصار ہر جگہ ملحوظ ہے۔ عبرت و نصیحت کے مقصد سے جس جگہ جتنی بات کہنی مناسب ہوئی ہے کہی گئی ہے۔ بعض جگہ تو بالکل سرسری اشارہ

---

[1] عنکبوت: ۳۷-۴۰ [2] نجم: ۵۰-۵۲۔

ہی پر کفایت کی گئی ہے۔ مثلاً "هَلْ اَتَاكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ، فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ"۔ یہ اسلوب کلام زبور میں بھی ملتا ہے۔ اس میں بھی اکثر مشہور واقعات کی طرف صرف اشارے کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر قرآن کے اس قسم کے مواقع سے آدمی سرسری طور پر گذر جائے تو اس پر کلام کا نظم اچھی طرح واضح نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ یہ موقع اس قسم کی چیزوں کی تفصیل کیلئے موزوں نہیں ہے لیکن یہاں ہم ان واقعات کی اتنی تفصیل ضروری سمجھتے ہیں جس سے اس سورہ کی ابتدائی قسموں اور سورہ کے اندر بیان کردہ سرگذشتوں کی باہمی مناسبت اچھی طرح واضح ہو جائے۔

یہ بات اوپر بیان ہو چکی ہے کہ اس سورہ کا آغاز ہوا اور دھاریوں والے آسمان کی قسموں سے ہوا ہے۔ اور یہ بھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ دھاریوں والے آسمان سے مراد سرما کے بادل ہیں جو ادلوں اور بجلی کی کڑک اور گرج کے ساتھ نمودار ہوا کرتے ہیں۔ اب آئیے یہ دیکھئے کہ اس سورہ میں جن قوموں کی سرگذشتیں بیان ہوئی ہیں اور جن سے اللہ تعالیٰ نے انتقام لیا ہے، یا جن کے مقابل میں اہل ایمان کی مدد فرمائی ہے، یہ انتقام اور نصرت کے سارے واقعات یا تو ہوا کے تصرفات کے کرشمے ہیں یا صاعقہ کے یا دونوں کے۔ آئندہ فصلوں میں ہم اس اجمال کی تفصیل پیش کریں گے۔

۱۵ — قوم لوط کی ہلاکت غبار انگیز ہوا کے ذریعہ سے ہوئی

قوم لوط پر اللہ تعالیٰ نے غبار انگیز ہوا بھیجی جو سخت ہو کر بالآخر حاصب

(کنکر پتھر برسانے والی تند ہوا) بن گئی۔ اس سے اوّل تو ان کے اوپر کنکروں اور پتھروں کی بارش ہوئی۔ پھر اس نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ اس کے زور سے ان کے مکانات بھی الٹ گئے۔ چنانچہ ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے :۔

فَمِنْهُمْ مَنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ	ان میں سے بعض قوموں پر ہم نے
حَاصِبًا (عنکبوت: ۴۰)	کنکر پتھر برسانے والی آندھی بھیجی۔

نیز فرمایا ہے :۔

فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا	پس ہم نے اس بستی کو پلٹ
وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً	کر دیا۔ اور ان کے اوپر سنگ گل
مِنْ سِجِّيْلٍ (حجر: ۷)	کی بارش کی۔

یعنی ایسی تند ہوائیں چلیں کہ ان کے مکانات اور چھتیں سب زمین کے برابر ہو گئیں اور اوپر سے کنکریوں اور ریت نے ان کو ڈھانک لیا۔ جیسا کہ فرمایا ہے :۔

وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى فَغَشّٰهَا	اور الٹی ہوئی بستیاں جن کو
مَا غَشّٰى	الٹ دیا اور پھر ان کو ڈھانک لیا
(نجم: ۵۳-۵۴)	جس چیز سے ڈھانک دیا۔

مشہور لغت لسان العرب میں مؤتفکۃ سے متعلق یہ تحقیق بیان ہوئی ہے۔

اَلْمُؤْتَفِکَات سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو زمین کو بالکل تلپٹ کر دیتی ہیں جس طرح جوتنے والا زمین کو تلپٹ کر دیتا ہے۔ جب کوئی بڑا سیلاب آتا ہے اور وہ زمین پر

مٹی اور ریت کی ایک نئی تہہ جما دیتا ہے تو اس کو بھی موتفکہ کہتے ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس جو تند ہوا زمین کو ریت اور کنکر پتھر سے ڈھانک دیتی ہے وہ بھی موتفکہ[1] ہے۔"

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے وہ یہ کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ قوم لوط پر جس چیز کی بارش کی گئی اس کے بارے میں توریت کا بیان قرآن کے بیان سے مختلف ہے۔ حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے ان دونوں کے درمیان جو اختلاف نظر آتا ہے وہ محض ترجمہ کی خرابی کا نتیجہ ہے۔ توراۃ کے مترجمین اچھی طرح سمجھ نہیں سکے کہ قوم لوط پر کیا چیز برسائی گئی تھی۔ اس وجہ سے انھوں نے اس کو آگ اور گندھک بنا دیا۔ حالانکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مترجمین نے جس چیز کو آگ کہا ہے یہ رعد اور برق ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ تورات میں اکثر رعد و برق کو آگ ہی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کی شہادت ان نشانیوں کی تفصیلات کے سلسلہ میں موجود ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے فرعون کو دکھائی ہیں چنانچہ کتاب الخروج (۹: ۲۳) میں ہے" اور خداوند نے رعد اور اولے بھیجے اور آگ زمین تک آنے لگی"۔ قرآن نے جہاں اس نشانی کا ذکر کیا ہے ان تینوں چیزوں کو ایک ہی جامع لفظ 'طوفان' سے تعبیر کر دیا ہے۔ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ[2] (تو ہم نے ان پر طوفان بھیجا) آگے حضرت نوح علیہ السّلام کی سرگذشت

---

[1] تیز آندھی کے یہ اثرات ریگستانی علاقوں میں جس قدر نمایاں ہوتے ہیں اس کا اندازہ اچھی طرح غیر ریگستانی علاقوں کے لوگ نہیں کر سکتے۔ اس بحث کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے یہ پیش نظر رکھیے کہ یہ صحرائے عرب سے متعلق ہے۔ (مترجم)   [2] اعراف: ۱۳۳۔

کے سلسلہ میں ہم اس کی وضاحت کریں گے۔

ہمارے اس خیال کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ توراۃ میں جہاں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی اس نشانی کا ذکر آیا ہے وہاں اگرچہ اولے اور کڑک کا تذکرہ سات مرتبہ ہوا ہے لیکن ایک مرتبہ بھی اس بات کا کہیں ذکر نہیں آیا ہے کہ اس آگ نے کسی چیز کو جلا یا ہو۔ البتہ ایک جگہ اس سلسلہ میں بارش کی تصریح ہے "جب فرعون نے دیکھا کہ بارش، اولے اور رعد تھم گئے تو اس نے اور اس کے خادموں نے اور زیادہ گناہ کیا کہ اپنا دل سخت کرلیا۔" اسی سلسلہ میں بارش، اور اولوں سے جو نقصانات پہونچے ہیں ان کی بھی تصریح ہے چنانچہ یہ الفاظ آتے ہیں "اور جو کو تو اولے مار گئے، کیونکہ جو کی بالیں نکل چکی تھیں اور سن میں پھول لگے ہوئے تھے۔" لیکن آگ سے کسی نقصان کے پہنچنے کا کوئی ادنیٰ اشارہ بھی موجود نہیں ہے۔ اس کی نظیر زبور (۱۴۸ : ۸) میں بھی موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"اے آگ اور اولو، اے برف اور کہر، اے طوفانی ہوا، جو اس کے حکم کی تعمیل کرتی ہے۔"

صاف ظاہر ہے کہ یہاں بھی آگ سے برق اور کڑک مراد ہے۔

رہی وہ بات جو لوط کی بستی کی تباہی کے سلسلہ میں توراۃ میں بیان ہوئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے دور سے دھواں اٹھتے ہوئے دیکھا تو اس سے مراد سیاہ غبار ہے جو دور سے دھوئیں کی صورت میں نظر آیا۔

رہی گندھک جس کا ذکر کتاب پیدائش (۱۹ : ۲۴) میں ہے کہ "تب خداوند نے

اپنی طرف سے سدوم اور عمورہ پر گندھک اور آگ آسمان سے برسائی"۔ تو اس سے مراد پتھر ہے۔ جس لفظ کا ترجمہ مترجموں نے گندھک کیا ہے وہ دراصل حصبا ہے جس کے معنی سنگریزے کے ہیں۔ اور یہیں سے خود انگریزی زبان میں برم اسٹون - Brim stone) کے اصل معنی کی تعیین میں بھی غلطی ہو گئی، لوگوں نے اس لفظ کے حقیقی معنی - - جلے ہوئے پتھر --- کو چھوڑ دیا اور گندھک کے معنی میں استعمال کرنے لگے۔ حالانکہ تورات میں اس بات کی نہایت واضح شہادت موجود ہے کہ اس سے مراد پتھر ہیں۔ سفر ایوب (۱۸ : ۱۵) میں شریروں کی ہلاکت کا ذکر کرتے ہوئے یہ الفاظ آئے ہیں :-

"وہ جو اس کا نہیں (یعنی اجنبی ہے) اس کے ڈیرے میں بسے گا، اس کے مکان پر گندھک چھڑائی جائے گی"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی قبر پر پتھر چنے جائیں گے جیسا کہ دستور ہے ورنہ قبر پر گندھک چھڑنے کا بھلا کیا مفہوم ہوگا؟

اس سے معلوم ہوا کہ قوم لوط پر اللہ تعالیٰ نے سنگریزے برسانے والی آندھی کا عذاب بھیجا جس نے ان کو اور ان کے مکانوں کو ڈھانک لیا اور اگر اس کے ساتھ تورات کا بیان بھی ملا لیا جائے تو یہ ماننا پڑیگا کہ ان کے اوپر حاصب کے ساتھ ساتھ برق و رعد کا عذاب بھی آیا۔

۱۶ --- فرعون اور اس کی قوم کی تباہی پردا ہوا سے ہوئی

حضرت موسیٰ علیہ السّلام اور فرعون کی سرگزشت قرآن اور تورات دونوں میں

اجمالاً اور تفصیلاً دونوں طرح بار بار بیان ہوئی ہے لیکن قرآن کی کسی ایک ہی سورہ میں پوری سرگذشت ایک جگہ نہیں بیان ہوئی ہے بلکہ ایک مشہور داستان کی طرح مختلف مقامات میں اس کی طرف اشارات کئے گئے ہیں۔ البتہ تورات میں اس کی پوری تفصیل ایک ہی سلسلہ میں بیان ہوئی ہے اور اس واقعہ میں ہوا کے عجیب وغریب تصرفات کو جو دخل ہے اور جس کی طرف قرآن نے صرف سرسری اشارہ کیا ہے، تورات نے اس کی بھی تفصیل کی ہے۔

سفر خروج (۱۴: ۲۱) میں واقعہ کی نوعیت یہ بیان کی گئی ہے:-

"پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا۔"

یہ پوربی آندھی رات بھر چلتی رہی اور صبح کو تھم گئی۔ ہوا کے زور نے سمندر کا پانی مغرب کی طرف خلیج سویز میں ڈال دیا اور مشرقی خلیج، خلیج عقبہ کو بالکل خشک چھوڑ دیا۔ پھر جب آندھی تھم گئی تو پانی اپنی جگہ پر پھیل گیا اور موسیٰ علیہ السّلام کا تعاقب کرنے والی جماعت غرق ہو گئی۔ اس کی تصدیق قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے۔ سورہ دخان میں ہے:-

فَأَسْرِ بِعِبَادِي لَيْلًا إِنَّكُمْ	پس میرے بندوں کو رات کے وقت
مُّتَّبَعُونَ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ	نکال لے جاؤ تمہارا تعاقب کیا
رَهْوًا ۖ إِنَّهُمْ جُندٌ	جائے گا اور سمندر کو ساکن چھوڑ دو

مُغْرَقُوْنَ (دخان: ۲۳-۲۴) بیشک وہ غرق ہونے والی فوج ہے۔

وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا میں "رھو" کے معنی سکون کے ہیں اور دریا کا سکون ظاہر ہے کہ ہوا کے سکون سے ہوتا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے:۔

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى	اور ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ میرے
اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ	بندوں کو شب میں نکال لے جاؤ
لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا	اور ان کے لئے راہ نکالو سمندر میں
لَا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى	خشک نہ تم کو پکڑے جانے کا خوف
فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ	ہوگا اور نہ ڈوبنے کا اندیشہ تو
فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا	فرعون نے اپنی فوجوں کے ساتھ
غَشِيَهُمْ۔	ان کا پیچھا کیا، پس سمندر میں سے
(طٰہٰ: ۷۷-۷۸)	ان کے اوپر چھا گئی جو چیز چھا گئی۔

سفر خروج (۱۵: ۱۰) میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ترانۂ حمد یوں نقل ہوا ہے:۔

تُو نے اپنی آندھی کی پھونک ماری تو سمندر نے ان کو چھپا لیا"

تثنیہ (۱۱: ۴) میں ہے۔

"اور اس نے مصر کے لشکر اور ان کے گھوڑوں اور رتھوں کا کیا حال کیا اور کیسے اس نے بحر قلزم کے پانی میں ان کو غرق کیا جب وہ تمھارا پیچھا کر رہے تھے اور خداوند نے ان کو کیسا ہلاک کیا کہ آج کے دن تک وہ نابود ہیں۔"

خلاصہ اس ساری تفصیل کا یہ نکلا کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو اللہ تعالیٰ نے تند ہوا کے ذریعہ سے نجات بخشی اور فرعون اور اس کی فوجوں کو نرم ہوا کے ذریعہ سے ہلاک کر دیا۔ یعنی رحمت اور عذاب دونوں کے کرشمے ہوا ہی کے عجیب و غریب تصرفات کے ذریعہ سے ظاہر ہوئے۔

یہاں ایک اور بات کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ علمار اہل کتاب اس امر میں مختلف نظریے رکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے کس مقام پہ سمندر کو عبور کیا اکثر وں کا خیال یہ ہے کہ انھوں نے خلیج سویز کو عبور کیا لیکن ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے کہ انھوں نے خلیج عقبہ کو عبور کیا۔ اسی طرح زمانۂ حال کے بعض متکلمین کا نظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جزر کے ذریعہ سے موسیٰ علیہ السّلام کو نجات دی اور مد کے ذریعہ سے فرعون اور اس کی فوجوں کو غرق کیا۔ ہم نے دوسری جگہ ان دونوں خیالات کی تفصیل کے ساتھ تردید کی ہے۔[1]

---

[1] یہاں مولانا نے بنی اسرائیل کے مقام عبور کے متعلق ایک بالکل نیا نظریہ پیش کیا ہے جو بہت سے ناظرین کے لئے حیرانی کا باعث ہوگا بالخصوص اس وجہ سے کہ یہاں انھوں نے اپنے نظریہ کی تائید میں کوئی دلیل نہیں پیش کی ہے۔ بلکہ دوسری جگہ کا حوالہ دیا ہے۔ مجھے یہ بحث نہ تو مولانا کی مطبوعہ تصنیفات ہی میں کہیں ملی اور نہ ان کے غیر مطبوعہ اوراق ہی میں کہیں نظر سے گذری۔ مگر مجھے یاد ہے کہ آخر تک ان کا یہی نظریہ رہا۔ ممکن ہے کسی اور سورہ کی تفسیر میں وہ اپنے اس نظریہ کی وضاحت کرنے کا ارادہ رکھتے رہے ہوں۔ لیکن یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا ہو۔ افسوس ہے کہ میں اس وقت مسودات کا جائزہ لینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ممکن ہے انھوں نے اس پہ کہیں مفصل نہیں تو اشارات ہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۲ پر)

۱۷۔ عاد اور ثمود کی ہلاکت

قرآن مجید میں قوم عاد کی ہلاکت کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان پر جو شخص غور کرے گا اس سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہ سکتی کہ جس تند ہوا کے ذریعہ سے وہ ہلاک کئے گئے اس کے ساتھ سرما کے وہ بادل بھی تھے جو ہمیشہ رعد و برق کے ساتھ نمودار ہوا کرتے ہیں۔ قرآن میں جہاں ان کی تباہی کا ذکر ہوا ہے ہوا کے ساتھ پانی سے خالی بادلوں اور صاعقہ کا بھی ذکر ہوا ہے۔ سورہ احقاف میں ہے:۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا
مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ قَالُوْا
هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا
بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ
رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ
تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا ۔
. . . .
(احقاف: ۲۴-۲۵)

پس جب انھوں نے اس کو (عذاب کو) دیکھا ابر کی صورت میں اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے ہوئے، بولے یہ تو بادل ہے جو ہم پر برسنے والا ہے۔ بلکہ یہ وہ چیز ہے جس کے لئے تم جلدی مچائے ہوئے تھے یعنی باد تند جس میں دردناک عذاب ہے۔ اکھاڑ پھینکے گی ہر چیز اپنے رب کے حکم سے۔

(بقیہ حاشیہ ص۹۱) کی صورت میں کچھ نوٹ لکھے ہوں۔ بہرحال یہ بڑی اہم بحث ناتمام رہی۔ (مترجم)

ظاہر ہے کہ یہ تمام خصوصیات موسم سرما کی ہیں۔ اس زمانہ میں عرب میں باد شمال صرصر کی شکل میں نمودار ہوتی ہے اور خشکی اور قحط کی ایک عام نحوست اور تباہی ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ سورۂ قمر میں اسی چیز کی طرف اشارہ فرمایا ہے :-

اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا	اور ہم نے ان پر باد صرصر چلا دی
صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ	قائم رہنے والی نحوست کے
مُّسْتَمِرٍّ	زمانہ میں۔

اسی طرح حم السجدہ میں ہے :-

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا	پس ہم نے ان پر باد صرصر
فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ۔	چلا دی نحوست کے زمانہ میں۔

باد صرصر کے یہ طوفان، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، عرب میں جاڑوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور یہی زمانہ ان کے ہاں نحوست اور فاقہ کا سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ جاہلیت کی مشہور شاعرہ لیلائے اخیلیہ کا شعر ہے ؎

ولا تاخذ الکوم الجلاد سلاحھا　　　لتوبتہ فی نحس الشتاء الصنابر

فربہ اور توانا اونٹنیوں کی فربہی توبہ کے لئے جاڑے کی ٹھنڈا در قحط میں ذبح سے مانع نہیں ہوتی۔

مشہور شاعر فرزدق کہتا ہے ؎

بعثت لہ دھماء لیست بلقحۃ　　　تدر اذا ما ھب نحسا عقیمھا

یعنی اس کے لئے سیاہ دیگ چولہے پر چڑھا دی جو قحط کے زمانہ میں جبکہ منحوس اور سرد ہوا چلتی ہے لوگوں کو خوب آسودہ کرتی ہے

سرما کی یہ تند ہوائیں جب چلتی تھیں تو دھاریوں والے سرخ بادلوں کے ٹکڑے اور اولے اور رعد و برق کی تمام آفتیں اپنے ساتھ لاتی تھیں۔ کلام عرب میں اسکی تمام تفصیلات ملتی ہیں اور فصل ثانی میں اس سے متعلق بعض ضروری باتیں بیان ہو چکی ہیں۔

حٰمٓ السجدۃ میں قوم عاد کے عذاب کے سلسلہ میں صاعقہ یعنی کڑک کی بھی تصریح ہے:-

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ	اگر وہ منہ پھیر لیں تو ان کو باخبر
صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ	کر دو کہ میں تم کو اس طرح کے
عَادٍ وَّثَمُوْدَ،	کڑک کے عذاب سے ڈراتا ہوں
(حٰمٓ السجدۃ: ۱۳)	جیسا عاد اور ثمود پر نازل ہوا۔

اس تصریح کے بعد یہ بات بالکل قطعی ہو جاتی ہے کہ ان پر کڑک کا عذاب نازل ہوا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ نے بادلوں، تند ہوا اور ہولناک کڑک کا عذاب نازل فرمایا لیکن چونکہ اصل تباہی زیادہ تر ہوا کے تصرفات سے واقع ہوئی اس وجہ سے اگر اثر سے موثر پر استدلال کرنے کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ثمود پر اللہ تعالیٰ نے دھاریوں والے بادل بھیجے جن کے اندر ان کے لئے ہولناک کڑک اور بہری کر دینے والی چیخ بھی چھپی ہوئی تھی جس طرح کہ قوم عاد پر رعد و برق والے بادل بھیجے۔ چونکہ ثمود کی تباہی صرف صاعقہ ہی کے ذریعہ سے واقع ہوئی تھی جیسا کہ سورۂ قمر میں فرمایا ہے:-

اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَیْھِمْ صَیْحَۃً وَّاحِدَۃً فَکَانُوْا کَھَشِیْمِ الْمُحْتَظِرِ۔

ہم نے ان کے اوپر ایک ہی ڈانٹ بھیجی تو وہ باڑے والے کی خشک اور ریزہ ریزہ لکڑیوں کے مانند ہو گئے

اس وجہ سے صرف صاعقہ کا ذکر کیا بادلوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ لیکن التزامی طور پر ثبوت ان کا بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح عاد کے ذکر میں ہوا کا ذکر بار بار کیا ہے لیکن بادلوں کا ذکر صرف ایک ہی جگہ کیا ہے۔ اور یہ قرآن مجید کا ایک خاص انداز ہے کہ وہ بعض مخصوص وجوہ کی بنا پر (جن کی طرف چودھویں فصل کے شروع میں ہم نے ضمناً اشارہ کر دیا ہے) واقعات کی تفصیلات اکثر نظر انداز کر دیتا ہے۔

۱۸۔ قوم نوح کی تباہی تند ہوا کے ذریعہ سے واقع ہوئی

نوح علیہ السّلام کی قوم کی تباہی سے متعلق اس سورہ میں کوئی تفصیل بیان نہیں ہوئی ہے۔ صرف اتنی بات اجمالاً کہی گئی ہے کہ جس طرح دوسری قوموں کو اللہ تعالیٰ نے عذاب میں پکڑا اسی طرح نوح علیہ السّلام کی قوم کو بھی عذاب میں پکڑا۔ لیکن قرآن اور تورات میں ان کی تباہی سے متعلق جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان کی تباہی میں بھی اصلی دخل ہوا کے تصرفات ہی کو رہا ہے۔ چنانچہ سورہ عنکبوت میں ارشاد ہے:۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی

اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی

قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ — طرف بھیجا اور وہ ان کے اندر
سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا — پچاس سال کم ایک ہزار سال
فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ — رہا پس ان کو پکڑا طوفان نے
وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ (عنکبوت: ۱۴) — اور وہ ظالم تھے۔

اس میں طوفان کا لفظ خاص طور پر لائق غور ہے۔ طوفان کے لغوی معنی دوران یعنی گردش کرنے اور چکر کھانے کے ہیں۔ عام استعمال میں اہل عرب اس سے وہ تند ہوا مراد لیتے ہیں جو تیزی سے چکر کھاتی ہوئی اٹھتی ہے۔ ایک جاہلی شاعر راعی اپنی اونٹنی کی تعریف میں کہتا ہے[1]

تمسی اذا العیس ادرکنا نکائثہا — خرقا یعتادھا الطوفان والزود

جب کہ مضبوط اونٹ بھی ہمت ہار جاتے ہیں اس وقت وہ ان پرخطر اور وسیع میدانوں کو طے کرتی ہے جنہیں تند ہوائیں چلتی ہیں۔

دوسری زبانوں میں بھی اس قسم کی تند ہوا کے لئے اسی طرح کے الفاظ ہیں مثلاً فارسی میں اس کو گرد باد کہتے ہیں انگریزی میں اس کو سائکلون (Cyclone) کہتے ہیں۔ ہندی میں اس کے لئے بگولے کا لفظ ہے۔ مصریوں کے ہاں ہوا کا ایک خاص دیوتا تھا جس کو طائفون[1] کہتے تھے اس ہوا کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے شدت کی بارش ہوتی ہے اور سمندر کا پانی جوش میں آجاتا ہے۔ میں جب کراچی میں تھا تو میں نے اس قسم کا طوفان بچشم خود دیکھا تھا۔ بحر ہند کے مشرق سے ایک طوفان اٹھا اور مغرب کی طرف

---

[1] انگریزی میں (Typhoon) سمندر کے سائکلونی طوفان کیلئے ایک عام مستعمل لفظ ہے۔ (مترجم)

گذر گیا۔ اس کے اثر سے نہایت سخت بارش ہوئی۔ جہازات پہاڑوں سے جا ٹکرائے۔ اور دوسرے بھی جانی ومالی بہت سے نقصانات ہوئے۔ تورات اور قرآن مجید میں طوفان نوح کے جو حالات بیان ہوئے ہیں وہ اس سے بہت ملتے جلتے ہوئے ہیں۔ سورۂ قمر میں ہے :۔

فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ	ہم نے آسمان کے دروازے موسلا
بِمَاءٍ مُّنْهَمِرٍ۔ وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ	دھار بارش کے ساتھ کھولدیئے اور
عُيُونًا فَالْتَقَى الْمَاءُ	زمین کے تمام چشمے پھوٹ نکلے ،
عَلَىٰ أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ۔	پس پانی ٹھہرائے ہوئے اندازہ
(قمر : ۱۱-۱۲)	تک پہنچ گیا۔

اسی طرح تورات کی کتاب پیدائش (۷ : ۱۱) میں ہے "بڑے سمندر کے سب سوتے پھوٹ نکلے اور آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں"۔ سورہ ہود میں ہے :۔

وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ	اور وہ کشتی ان کو لے کر ایسی
كَالْجِبَالِ۔	موجوں کے اندر چل رہی تھی جو
(ھود)	پہاڑوں کی طرح بلند ہو رہی تھیں۔

جن لوگوں کو سمندر کے سفر کا اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ پہاڑ کی طرح موجوں کا اٹھنا صرف اسی حالت میں ہوتا ہے۔ جب تند ہوا چل رہی ہو۔ اس وجہ سے موجوں کا ذکر خود بخود اس بات کی دلیل ہے کہ تند ہوا موجود تھی۔ اثر کا ذکر کرکے موثر کو بتانا عربی زبان کا ایک مشہور طریقہ ہے اور قرآن مجید نے ایک سے زیادہ مقامات میں ہوا

اور موجوں کے لازم و ملزوم ہونے کو بیان کر کے ان دونوں کے ایک دوسرے کے ساتھ تعلق کو نہایت قریب الفہم بنا دیا ہے۔ مثلاً :۔

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ فِی الْبَرِّ	وہی ہے جو تم کو سفر کراتا ہے خشکی اور
وَالْبَحْرِ حَتّٰۤی اِذَا کُنْتُمْ	تری میں، یہاں تک کہ جب تم
فِی الْفُلْكِ وَجَرَیْنَ بِهِمْ	کشتی میں سوار ہوتے ہو اور کشتی
بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا	ان کو سازگار ہوا کے ذریعہ سے
جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ	لے کر چلتی ہے اور وہ خوش ہوتے
وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ	ہیں، آتی ہے اس پر ایک باد تند
كُلِّ مَكَانٍ۔	اور موجیں اٹھنے لگتی ہیں ہر
(یونس : ۲۲)	طرف سے۔

علاوہ ازیں وَجَرَیْنَ بِهِمْ (اور وہ ان کو لے کر چلتی ہے) کے الفاظ کے اندر خود ہوا کا ثبوت موجود ہے کیونکہ قرآن نے دوسری جگہ اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہوا کو ٹھہرا دے تو یہ کشتیاں سمندر کی سطح پر کھڑی رہ جائیں۔

وَمِنْ اٰیٰتِهِ الْجَوَارِ	اور اس کی نشانیوں میں سے یہ
فِی الْبَحْرِ کَالْاَعْلَامِ	پہاڑ کے سے جہازات ہیں جو سمندر
اِنْ یَّشَاْ یُسْكِنِ الرِّیْحَ	میں چلتے ہیں۔ اگر خدا چاہے تو
فَیَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ	ہوا کو روک دے اور یہ سطح پر

عَلٰی ظَھْرِہٖ، (شوریٰ: ۳۲-۳۳) — کھڑے کے کھڑے رہ جائیں۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:-

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِیُذِیْقَکُمْ مِّنْ رَّحْمَتِہٖ وَلِتَجْرِیَ الْفُلْکُ بِاَمْرِہٖ (روم: ۴۶)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ بھیجتا ہے ہواؤں کو بشارت بناکر اور تاکہ تمہیں اپنی رحمت سے شادکام کرے اور تاکہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ قوم نوح پر تند اور جکڑ دار ہوا کا طوفان آیا جس سے سخت بارش ہوئی، پاس کے سمندروں کا پانی ابل پڑا اور ہر طرف سے موجیں اچھلنے لگیں۔ اس طوفان کے اندر نوح علیہ السّلام کا سفینہ کوہ جودی پر جا کے ٹکا۔

یہاں تورات کے مترجمین کی ایک غلطی کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے۔

کتاب پیدائش (۸: ۱) میں ہے کہ:-

"اور خدا نے زمین پر ایک ہوا چلائی اور پانی رک گیا اور سمندر کے سوتے اور آسمان کے دریچے بند کئے گئے اور آسمان سے جو بارش ہو رہی تھی تھم گئی"

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طوفان کو روکنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے دوسری نرم ہوا چلائی تھی۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ بات صحیح نہیں ہے۔ یہاں جس لفظ کا ترجمہ ہوا کیا گیا ہے۔ اس سے مراد درحقیقت حکم رب ہے، جیسا کہ سورۂ ہود میں ہے:-

وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ۔	اور حکم ہوا کہ اے زمین اپنا پانی پی جا اور اے آسمان تھم جا اور پانی جذب کر لیا گیا اور معاملہ کا فیصلہ ہو گیا۔
(ھود: ۴۴)	

تورات کے ترجمہ میں گڑبڑی کی وجہ یہ ہے کہ عبرانی میں ہوا، حکم اور کلمہ کے مختلف معنوں کے لئے ایک ہی مشترک لفظ ہے۔ قرآن نے اپنے بیان میں اس گڑبڑی کو رفع کر دیا ہے اور قرآن مجید کا یہ طریقہ ہے کہ وہ اکثر ان تحریفات کی طرف اشارہ کرتا رہتا ہے جو اہل کتاب نے اپنے صحیفوں میں کر رکھی ہیں۔ اس بحث کو ہم اس کی جگہ پر مفصل لکھ چکے ہیں۔

۱۹۔ ان واقعات کی ترتیب پر ایک نظر

اور

مقسم بہ اور آیات مابعد سے ان کا تعلق

ابتدائے سورہ کی قسموں سے ان واقعات کا تعلق اجمالاً اوپر کے بیانات سے واضح ہو چکا ہے لیکن ابھی ان پر تفصیلی نظر ڈالنی باقی ہے۔ قرآن کے واقعات چونکہ عبرت و موعظت اور دلیل و حجت کے مختلف پہلو اپنے اندر رکھتے ہیں اس وجہ سے موقع کے

تقاضے سے ان کی ترتیب بدل بدل جاتی ہے۔ یہاں جو ترتیب ملحوظ ہے ہم مختصراً اس کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السّلام کی جو سرگذشت یہاں بیان ہوئی ہے اس کا ایک پہلو تو بالکل واضح ہے کہ اس میں بشارت اور انذار دونوں ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ بعینہٖ یہی حال ہواؤں کا بھی ہے۔ وہ بھی کبھی پیام رحمت بنکر ظاہر ہوتی ہے اور کبھی صورت عذاب بن کر۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے واقعہ کی یہ جامع حیثیت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ یہاں وہی تمہید کی جگہ پائے۔

اس کے بعد قوم لوط کی سرگذشت بیان کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربوں کو ان کی تباہ شدہ بستیوں پر سے گذرنے اور ان کے آثار و نشانات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع اکثر ملتا رہتا تھا علاوہ ازیں مقسم بہ کے پہلے ٹکڑے ”وَالذّٰرِیٰاتِ ذَرْوًا فَالْحَامِلَاتِ وِقْرًا“ (قسم ہے ان ہواؤں کی جو غبار اڑاتی ہوئی چلتی ہیں، پھر اٹھالیتی ہیں بوجھ) سے سب سے زیادہ قریبی مناسبت قوم لوط کی تباہی کے واقعہ ہی کو تھی کیونکہ ان کی تباہی تند ہوا سے ہوئی تھی جس نے ریت اور سنگریزوں سے ان کو ڈھانپ لیا اور اس ریت اور سنگریزے کی اتنی مقدار ان کے اوپر ڈالی کہ اس کے نیچے ان کی بستیاں بھی ڈھک گئیں۔

نیز اوپر جو فرمایا تھا ”وَفِی الْاَرْضِ اٰیَاتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ“ (اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں) تو قوم لوط کی اس سرگذشت میں اس دعویٰ کا بھی

نہایت واضح ثبوت موجود تھا، جیسا کہ ہم گیارھویں فصل میں اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔
غرض یہ چار وجوہ تھے جن کے سبب سے اس سرگذشت کو یہاں ترتیب میں متقدم رکھا۔
اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی سرگذشت ہے۔ یہ سرگذشت اولاً تو قرآن مجید میں باربار بیان ہوئی ہے اور اپنے اندر نہایت قیمتی اثرات ونتائج رکھتی ہے ثانیاً اس کو مقسم بہ کے دوسرے ٹکڑے "فَالْحَامِلَاتِ وِقْرًا فَالْجَارِيَاتِ يُسْرًا" (پھر بوجھ اٹھا لینے والی پھر آہستہ چلنے والی) سے نہایت واضح مناسبت ہے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی لحاظ کے قابل ہے کہ اس سرگذشت کو اور اس سے اوپر والی سرگذشت کو انبیائے کرام علیہم السّلام کے ناموں سے شروع کیا جس سے اس بات کا اشارہ نکلتا ہے کہ ان کے اندر بشارت کا پہلو نمایاں ہے۔ اس کے بعد قوموں کی سرگذشتیں ان کے نام لے کر سنائی ہیں جن کے اندر انذار کا پہلو غالب ہے۔ اس ذیل میں عاد اور ثمود کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔ ان کے متعلق یہ بات قطعی طور پر معلوم ہے کہ ان کے اوپر جو عذاب آیا "دھاریوں والے بادلوں" (وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْحُبُكِ) کا کرشمہ تھا۔ اب غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جو ترتیب قسموں میں ملحوظ رکھی گئی تھی اسی کے مناسب ترتیب قوموں کے ذکر میں بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ عاد اور ثمود کے ذکر میں عاد کو متقدم رکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقدم زمانی کے علاوہ ان کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ ان پر جو عذاب آیا وہ ہوا اور بادل دونوں کے کرشموں کا مجموعہ تھا۔

باقی رہی نوح علیہ السّلام کی سرگذشت تو وہ تمام قوموں اور امتوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ایک غیر فانی نشانی ہے۔ چنانچہ یہ آیت اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے:-

إِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَاءُ حَمَلْنَٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَتَعِيَهَا أُذُنٌ وَاعِيَةٌ ۝ (الحاقۃ: ۱۱-۱۲)	جب پانی حد سے بڑھ گیا تو ہم نے تم کو کشتی میں اٹھا لیا تاکہ ہم اس سرگذشت کو تمھارے لئے یادہانی بنائیں اور اس کو محفوظ رکھنے والے کان محفوظ کریں۔

اوپر والی فصل میں پڑھ چکے ہو کہ اس سرگذشت کے اندر زمین، آسمان، ہوا، بادل، کشتی اور پانی سب کے عجائب اور کرشمے جمع ہو گئے ہیں۔ اس جامعیت کے سبب سے اس سرگذشت نے آفاقی و انفسی دلائل و شواہد کے ایک مجموعہ کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ چنانچہ اوپر ہوا کی جو شہادتیں بیان ہوئی تھیں اور بعد میں زمین، آسمان اور نفس کے جن آثار و دلائل کی طرف اشارہ کیا گیا تھا ان سب کے لحاظ سے مناسب ہوا کہ قوم نوح کی یہ جامع سرگذشت سنا کر ان ساری حقیقتوں کو بالکل متمثل کر کے نگاہوں کے سامنے رکھ دیا جائے۔

نیز چونکہ عاد و ثمود کو قوم نوحؑ کے بعد ہی زمین کی خلافت ملی تھی۔ اس وجہ سے بھی مناسب ہوا کہ ان کے ذکر کے ساتھ قوم نوحؑ کا بھی حوالہ دے دیا جائے۔ قرآن مجید میں اس کی دوسری مثال بھی موجود ہے۔

وَأَنَّهُ أَهْلَكَ عَادًا الْأُولَىٰ	اور اس نے عاد اول کو ہلاک کیا

وَثَمُوْدَ فَمَآ اَبْقٰى وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ، اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى ۔	اور ثمود کو پس ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑا اور اس سے پہلے قوم نوح کو ہلاک کیا۔ یہی لوگ ظالم اور سرکش تھے۔
(نجم: ۵۰ - ۵۲)	

اس آیت میں "قوم نوح من قبل" کا ٹکڑا خاص طور پر قابل غور ہے۔

پھر چونکہ یہ سرگذشت مشہور اور قدیم ہونے کے علاوہ تمام قوموں اور امتوں کی مشترک سرگذشت تھی اس وجہ سے اولاً تو اس کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہی کافی ہو ثانیاً اس کو ایک اہتمامی سرگذشت کی حیثیت سے ذکر کیا گیا نیز ایجاز و اختصار کی خوبی دیکھئے کہ محض اسلوب کی تبدیلی کے ذریعہ سے یہ ظاہر کر دیا کہ ماقبل کے سلسلے سے اس کو کسی قدر جداگانہ اور مستقل حیثیت و اہمیت حاصل ہے چنانچہ "وفی نوح" نہیں کہا جیسا کہ اوپر سے چلا آرہا تھا "وَفِیْ مُوْسٰی" "وَفِیْ عَادٍ" بلکہ فرمایا "وَقَوْمَ نُوْحٍ" تاکہ بدلا ہوا اسلوب خود تبلا دے کہ اس سرگذشت کی اہمیت کچھ اور ہے علاوہ ازیں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ اس سرگذشت کو حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی سرگذشت کے ذیل میں بھی نہیں رکھا۔

۲۰ - اس مجموعۂ آیات کا تعلق مابعد سے

یہ معلوم ہے کہ اسلام کی ابتدائی دعوت کے بنیادی مسائل تین تھے۔ توحید۔ قیامت اور رسالت۔ چونکہ ان تینوں میں باہم گہرا نہایت گہرا معنوی ربط و تعلق ہے اس وجہ سے اکثر

ان تینوں کا ذکر ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک کا ذکر کرتے کرتے دوسرے کے ذکر کی طرف گریز کر جاتے ہیں۔

آٹھویں فصل کے شروع میں ہم یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ قیامت اور رسالت کے تمام دلائل درحقیقت عقیدۂ توحید کے لازمی نتائج کی حیثیت سے پیدا ہوتے ہیں اور اسی کی شاخ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی اصول کے مطابق یہاں جزا اور سزا کے دلائل بیان کرنے کے بعد توحید پر دلیل پیش کی ہے اور اسی دلیل پر اس سلسلہ کو مکمل کیا ہے۔ لیکن اسلوب کلام ایسا ہے کہ گفتگو منقطع نہیں ہونے پائی ہے بلکہ سلسلۂ سخن کو باقی رکھتے ہوئے ایک مطلب سے دوسرے مطلب کی طرف گریز کیا ہے اور اس کے اندر دعوت کے تیسرے بنیادی مقصد یعنی رسالت کا بھی ضمناً ذکر آگیا ہے۔ فرمایا ہے :-

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ○ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ○ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○ وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○

اور آسمان کو ہم نے بنایا قوت کے ساتھ اور ہم بڑی وسعت رکھنے والے ہیں۔ اور زمین کو ہم نے بچھایا، پس کیا ہی اچھے بچھانے والے ہیں۔ اور ہر چیز کے اندر ہم نے پیدا کئے جوڑے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔ پس اللہ کی طرف

بچا گو، میں اس کی طرف سے تمہارے لئے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ بناؤ۔ میں اس کی جانب سے تمہارے لئے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔

۲۱ ـ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

(۴۷ - ۵۱)

وَالسَّمَآءَ الایۃ اوپر جو واقعاتی شہادتیں جزا اور سزا کی گذری ہیں یہ انہی پر عطف ہے۔ واقعاتی شہادتوں کے بعد یہ فطری دلائل بیان ہوئے ہیں۔

بِاَیْدٍ یعنی قوت کے ساتھ۔ ایدہ کے معنی ہیں اس کو قوت پہنچائی۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ آسمان خدا کی عظیم قوت وقدرت اور اس کی بے پایاں حکمت کا ایک شاندار مظہر ہے۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰهَا ۔ (نٰزعٰت : ۲۷)

کیا تمہارا بنانا زیادہ مشکل ہے یا آسمان کا، اس کو بلند کیا۔

لَمُوْسِعُوْنَ یعنی اس کا اقتدار اور اس کا اختیار نہایت وسیع ہے۔ جو شخص آسمان کی بلندی، اس کی وسعت، اس کے عجائب اور اس کے ناپیداکنار ہونے پر غور کرے گا وہ اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا کہ اس کا بنانے والا غیر محدود اختیار و اقتدار کا مالک ہے۔

فَرَشْنَاهَا یعنی خدا نے زمین کو ہمارے لئے فرش بنا کر بچھایا۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے:۔

جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ	اس نے تمھارے لئے زمین کو
فِرَاشًا (بقرہ)	بچھونا بنایا۔

نیز فرمایا:۔

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ	کیا ہم نے زمین کو گہوارہ
مِهَادًا (رعد: ۲)	نہیں بنایا۔

ایک اور جگہ ہے:۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ	وہی ہے جس نے زمین کو تمھارے
ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا	لئے فرمانبردار بنایا تو چلو پھرو
(ملک: ۱۵)	اس کے کندھوں پر۔

خَلَقْنَا آیت کا موقع اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ آسمان کا بلند کیا جانا اور زمین کو بچھایا جانا بھی "خَلَقْنَا" کے تحت داخل ہے۔ اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر اس آیت کے مفہوم پر غور کیا جائے تو پوری بات یوں ہوگی کہ جس طرح اس نے آسمان کو بلند کیا اور زمین کو بچھایا اور اس جوڑے سے اس نے اپنے بندوں کے لئے بے شمار فوائد و منافع پیدا کئے۔ اسی طرح اس نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا بنایا ہے تاکہ تم اس سے معاد کا یقین حاصل کرو اور اس بات پر ایمان لاؤ کہ تنہا اللہ تعالیٰ ہی تمام مخلوق کا

رب ہے۔ وہ تمام خلق سے اوپر ہے اور برہے، قدیر ہے، رحیم اور حکیم ہے۔ اس کی مزید تفصیل اگلی فصل میں آئے گی۔

زَوْجَیْنِ | زوج کے دو مفہوم ہیں:۔ ایک یہ کہ جوڑے کا ہر فرد دوسرے کی تکمیل کرتا ہے اور دونوں باہمی سازگاری سے ایک صالح نتیجہ پیدا کرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا ہے:۔

وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ (انبیاء: ۹۰) — اور ہم نے اس کے لئے اس کے جوڑے کو سازگار بنایا۔

اور دوسرا یہ کہ جوڑے کا ہر فرد دوسرے کا مدمقابل ہے۔ مثلاً فرمایا ہے:۔

وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى (طٰہٰ: ۵۳) — اور آسمان سے پانی اتارا، پس ہم نے اس سے اگائیں قسم قسم کی نباتات۔

نیز فرمایا:۔

وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ (ق: ۷) — اور ہم نے اس میں قسم قسم کی خوش منظر چیزیں پیدا کیں۔

مِنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ | منہ ۔ یعنی اس کی جانب سے۔ یہ نذیر کا صلہ نہیں ہے کیونکہ عربی میں اَنْذَرَهٗ مِنْهُ نہیں استعمال ہوتا بلکہ اَنْذَرَهٗ اِيَّاهٗ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ یہ ایک ہی جملہ دو جگہ محض تکرار کے لئے نہیں استعمال ہوا ہے بلکہ دونوں الگ الگ موقع سے علیٰحدہ علیٰحدہ

مقصد کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔ پہلی جگہ یہ ترغیب کے مقصد سے استعمال ہوا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل خاص سے تمہارے لئے ایک ڈرانے والا بھیجا ہے تاکہ وہ تم کو غفلت اور ہلاکات میں پڑنے سے بچائے اور تم اپنے رحمان و رحیم رب کی طرف بھاگو۔ اور دوسری جگہ یہ ترہیب کے مقصد سے ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ شرک ایک گناہ عظیم ہے اور اس کے مرتکب کا کوئی عذر بھی نہیں سنا جائے گا۔ اس وجہ سے اس نے اپنی طرف سے ایک نذیر مبین بھیجا تاکہ اس برائی کے نتائج سے وہ تم کو اچھی طرح باخبر کر دے۔ پس تم شرک سے اپنے آپ کو بچاؤ۔

۲۲ - ہر چیز کا جوڑے جوڑے ہونا توحید، رسالت اور معاد پر دلیل ہے

جہاں تک خدا کے موجود ہونے کا تعلق ہے یہ چیز فطرتاً اس قدر واضح ہے کہ اس پر کوئی دلیل لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اکثر مذاہب میں خدا کا عقیدہ پایا جاتا ہے اور یہ وسیع کائنات اور اس کے عجائب و غرائب اس قطعیت کے ساتھ اس کی شہادت دے رہے ہیں کہ کسی طرح بھی اس کا انکار ممکن نہیں ہے۔ بحث و اختلاف اگر ہے تو خدا کے ماننے میں نہیں ہے بلکہ اس کو صحیح طور پر ماننے میں ہے۔ اکثر لوگ خدا کو مانتے تو ہیں لیکن اس طرح نہیں مانتے جس طرح اس کو ماننا چاہیئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ خدا کو ماننے کے باوجود بھی گویا اس کے منکر ہی ہیں۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف ان الفاظ میں

توجہ دلائی ہے :-

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ — اور ان میں سے اکثر خدا پر ایمان
إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ (یوسف ۱۰۶) — نہیں رکھتے مگر شرک کے ساتھ۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن عموماً جب خالق پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے تو یہ دعوت اس طرح دیتا ہے کہ ساتھ ہی ساتھ شرک کی تردید بھی ہو جائے اور توحید پر ایمان لانے سے آخرت اور رسالت پر ایمان لانا جو لازم آتا ہے اس کی طرف بھی اشارہ ہو جائے۔ قرآن مجید نے یہ طریقہ بحث اجمالاً اور تفصیلاً دونوں طریقہ سے اختیار کیا ہے لیکن یہاں اس پر کسی تفصیلی بحث کا موقع نہیں ہے۔ ہم صرف بقدر ضرورت گفتگو پر کفایت کریں گے۔

یہاں ہر چیز کے جوڑے جوڑے پیدا کرنے سے جو استدلال کیا ہے وہ دو پہلوؤں سے ہے اور یہ دونوں پہلو لفظ "زوج" کے دو مختلف معنوں سے پیدا ہوئے ہیں[1]۔

۱۔ استدلال کا پہلا رخ یہ ہے کہ یہ تمام کائنات اپنی وسعت اور اپنے مختلف اجزا کے طبائع کے اختلاف کے باوجود اس بات پر گواہ ہے کہ اس ساری کائنات کا رب ایک ہی ہے۔ وہی اس پوری کائنات کا انتظام فرما رہا ہے، اور وہی اس پر تنہا قابض و متصرف ہے۔ اگر اس کائنات کے مختلف حصوں کے رب الگ الگ ہوتے اور وہ اپنے اپنے نقشہ کے مطابق ان کا انتظام کرتے تو یہ ناممکن تھا کہ اس کے مختلف اجزا میں

---

[1] "زوج" کا لفظ جوڑے کے معنی میں بھی آتا ہے اور انواع و اقسام کے معنی میں بھی آتا ہے مصنف نے ان دونوں معنوں کے لحاظ سے استدلال کے دو پہلو اختیار کئے ہیں۔ (مترجم)

وہ توافق و سازگاری پائی جا سکتی جو پائی جا رہی ہے۔ یہ مختلف اجزاء ہرگز کسی ایسے نتیجہ کے پیدا کرنے پر متفق نہیں ہو سکتے تھے جو خود ان کو حاصل ہونے کے بجائے کسی اور بالاتر مقصد کے کام آتا حالانکہ ہم اس کائنات کے مختلف اجزاء کو اپنے سے بالاتر اور اپنے سے بعید تر کی خدمت میں ہر آن سرگرم کار دیکھ رہے ہیں۔

ملحدین اور فلاسفہ کے ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ ہر چیز کا نشو و نما اور اس کی تکمیل قدرتی ان قوتوں کا نتیجہ ہے جو خود اس کے اپنے وجود کے اندر چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہی قوتیں اس کے لئے مناسب حال اعضاء پیدا کرتی ہیں اور وہی اس کی تمام ضروریات پوری کرتی ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ خیال ایک لغو خیال ہے۔ اگر ہر چیز کا ارتقاء اسکی اپنی اندرونی ہی قوتوں کی تحریک اور رہنمائی سے ہو رہا ہے تو آخر وہ ان چیزوں کے ساتھ موافقت اور سازگاری کس طرح پیدا کر لیتی ہے۔ جو اس کے علم اور اس کی ضروریات کے دائرہ سے بالکل خارج اور نہایت دور ہیں؟ جوڑے کے ہر فرد کا ایک دوسرے کے لئے سازگار ہونا تو اس بات کی صاف دلیل ہے کہ ان کی خالق ان سے الگ کوئی ایسی بالاتر ہستی ہے جو ان کے فوائد و مصالح کو اچھی طرح سمجھتی ہے اور جو جوڑے کے ہر فرد کو دوسرے کے لئے معاون اور سازگار بناتی ہے۔

علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی مخفی نہیں رہنی چاہیئے کہ یہ دنیا بحیثیت مجموعی ایک وحدت ہے اور اس کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جو کھلے طور پر ناقص نظر آ رہے ہیں اور اس کا وجود اپنی تکمیل کے لئے کسی ایسے جوڑے کا تقاضا کر رہا ہے جس سے اس کے اس

نقص کی تلافی ہو سکے اور جس کے ساتھ مل کر یہ اپنے مصالح کی تکمیل کر سکے۔ یہی چیز ہے جس کو آخرت کہتے ہیں۔

اب غور کیجئے تو اس استدلال سے دو بڑی اہم حقیقتیں واضح ہوئیں۔

ایک تو ایک ایسے خالق کا اثبات جو قادر ہے، حکیم ہے، جس نے کائنات کے ہر جزء کو دوسرے جزء کے نقص کی تلافی کرنے والا اور اس کے ساتھ اس کے جوڑے کی حیثیت سے تعاون اور سازگاری کرنے والا بنایا ہے تاکہ وہ باہم مل کر ان مصالح کو وجود میں لائیں جو اس کے بندوں کے لئے مفید ہیں۔

دوسرے معاد اور دار آخرت کا اثبات جو اس ظاہری اور فانی دنیا کے لئے بمنزلہ زوج کے ہے اور جس سے اس سارے نقص کی تلافی ہو گی جو اس دنیا کے اندر محسوس ہو رہا ہے۔

یہ استدلال سورۂ شمس کی تفسیر میں کسی قدر وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ وہاں دیکھنا چاہیئے۔

۲۔ استدلال کا دوسرا رخ یہ ہے کہ یہ تمام کائنات مختلف ایسی انواع سے بھری ہوئی ہے جو اپنی اصل، اپنے ماحول اور اپنے اسباب میں مشترک و متحد ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی بالکل مخالف ہیں۔ یہ چیز اس بات پر دلیل ہے کہ اس کائنات کا انتظام کرنے والا ایک رب ہے جو ان تمام انواع کی ان کے نوعی تقاضوں کے مطابق تربیت کر رہا ہے اور لازماً وہ واحد بھی ہے اور ان سب سے بالاتر بھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ

ان مختلف اجزاء کی باہمی کشمکش کے باوجود وہ اس طرح ان کی تدبیر فرما رہا ہے کہ ان میں سے کوئی جزء بھی دوسرے جزء سے متصادم نہیں ہو سکتا۔ اور اس دنیا کا انتظام بغیر کسی خلل اور خرابی کے برابر چل رہا ہے۔

یہ چیز جس طرح اس بات پر دلیل ہے کہ قدرت، تصرف اور علم اور حکمت میں خدا کا کوئی شریک نہیں ہے اسی طرح اس بات پر بھی دلیل ہے کہ اس نے ہر چیز کے سپرد وہی کام کیا ہے جس کے وہ لائق ہے۔ اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ وہ نیکوکار اور بدکار اور فرمانبردار اور باغی کے ساتھ ایک ہی قسم کا معاملہ نہیں کرے گا۔ یہ چیز جزاء و سزا کے حق ہونے پر دلیل ہے۔ یہ دلیل قرآن مجید میں متعدد مقامات میں بیان ہوئی ہے اس وجہ سے ہم نے یہاں اس کی زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں سمجھی ہے۔

ہر چیز کے جوڑا جوڑا پیدا ہونے سے یہ استدلال اپنے مذکورہ دونوں پہلوؤں سے جس طرح اس بات کو ثابت کر رہا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے جو واحد ہے اور اس تمام کائنات کی تدبیر فرما رہا ہے۔ اسی طرح اس بات کو بھی ثابت کر رہا ہے کہ یہ خالق مہربان اور محبت کرنے والا ہے، اس کا علم اور اس کی رحمت ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور آسمان سے لیکر زمین تک ہر چیز اس کے قبضہ و تصرف میں ہے اور وہ ان کو اپنے بندوں کی خدمت اور ان کی نفع رسانی میں سرگرم کار کئے ہوئے ہے۔

اور جب اس کی رحمت اور قدرت ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے تو ظاہر ہے کہ اسی کی یہ شان ہے کہ وہ سب کا ملجا و ماویٰ ہے کیونکہ تمام نفع اور تمام نقصان اسی کے قبضہ میں ہے

قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں اس کی تصریح فرما دی ہے۔

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ

(فاطر: ۲-۳)

اللہ لوگوں کیلئے جو رحمت جاری کرے کوئی اس کو روکنے والا نہیں اور جس کو روک دے تو اس کے روکنے کے بعد کوئی اس کو جاری کرنے والا نہیں۔ وہ غالب اور حکمت والا ہے۔ اے لوگو! اللہ کا جو فضل تم پر ہے اس کو یاد رکھو، کیا اللہ کے سوا کوئی اور رازق ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے روزی دے رہا ہے اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں تو تم کہاں کہاں بھٹکے جاتے ہو۔ یعنی جب ملجا وہی ہے، مولیٰ وہی ہے اور دیکھ رہے ہو کہ تمام نعمتیں جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں اسی کی ہیں۔ اور اسی کی رحمت کا دامن ہے جو تم کو چھپائے ہوئے ہے تو پھر اس کو چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟

اللہ تعالیٰ کے اس کمالِ رحمت ہی کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ وہ نبیوں اور رسولوں کو بھیجتا ہے جو بندگانِ الٰہی کو ان لوگوں کے برے اعمال کی تقلید سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں جو نیکی کے راستہ سے ہٹ کر چلتے ہیں اور جو اپنے حقیقی آقا اور مولیٰ سے منہ موڑتے ہوئے

ہوتے ہیں۔ رسولوں کا اصلی فریضہ یہی ہے کہ وہ لوگوں کو ڈرائیں تاکہ وہ اپنے مولائے حقیقی کی طرف بھاگیں اور جو عذاب ان پر نازل ہونے کے لئے منڈلا رہا ہے اس سے ان کو اچھی طرح آگاہ کردیں۔ اب اگر کوئی شخص رسولوں کی بات پر دھیان نہیں دیتا حالانکہ وہ پورے جذبہ خیر خواہی، پوری وضاحت اور نہایت قطعی دلائل کے ساتھ کہی جا رہی ہے تو وہ خود اپنے آپ کو ہلاکت کے گڑھے میں ڈھکیل رہا ہے اور اس پر وہ خود ہی ملامت کا مستحق ہے نہ کہ کوئی اور۔ اولاً تو وہ خود اپنے آقا سے بھاگا ہے ثانیاً وہ بلانے والے کی بات بھی سننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ثالثاً وہ ان تمام برے نتائج کا منکر ہے جو اس کی شرارت کی پاداش میں اس کے سامنے آنے والے ہیں ــــ یہ تین باتیں ہیں اور یہ آئتیں ان تینوں باتوں کی طرف اشارہ کر رہی ہیں، اور ساتھ ہی یہ توحید کی طرف ایک ایسے پہلو سے دعوت دے رہی ہیں جس سے آپ سے آپ رسالت اور جزا و سزا پر ایمان کی دعوت بھی نکل رہی ہے اور یہ حقیقت واضح ہو رہی ہے کہ رسالت اور معاد پر ایمان لانا ایک ایسے خدا پر ایمان لانے کا لازمی نتیجہ ہے جس کو واحد، مہربان اور قادر و حکیم مانا گیا ہے۔

۲۳ ۔ ان آیات کا نظم باہم دگر اور ان کا تعلق آگے پیچھے سے

اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ان آیات کا مقصد فطرت کی نشانیوں کی مدد سے کفار کو اس بات کی دعوت دینا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تمہارا رب ہے جس نے تم کو پیدا کیا ہے اور جس نے تمھیں رزق بخشا ہے۔ نیز یہ بتانا مقصود ہے کہ جنھوں نے خدا کی نافرمانی

کی اور اس کے رسولوں کی بات نہ مانی، ان کا انجام نہایت برا ہوا ہے۔ اگر تم بھی انہی کی راہ اختیار کروگے تو لازماً اسی طرح کا عذاب تم پر بھی آئے گا جس طرح کا عذاب ان پر آیا۔ جیسا کہ ایک جگہ فرمایا ہے:۔

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ	اگر وہ اعراض کریں تو ان سے کہدو
صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ	کہ میں تم کو اس قسم کے کڑاک کے
عَادٍ وَثَمُودَ۔	عذاب سے ڈراتا ہوں جس قسم کا
(حم السجدہ: ۱۳)	عذاب عاد و ثمود پر آیا۔

نیز ان کے سامنے یہ بات بھی واضح کرنی ہے کہ خدا کے سوا کوئی اور رب یا کوئی اور پناہ دینے والا نہیں ہے "وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ" (وہی پناہ دیتا ہے اس سے کسی کو پناہ نہیں دی جا سکتی) ہر چیز سے اس کی رحمت، اس کی قدرت، اس کے احاطۂ علم اور اسکی حکمت کی شہادتیں مل رہی ہیں اس وجہ سے اسی کی طرف بھاگو اور ان رسولوں کی بات مانو جن کو اس نے لوگوں کو اپنی طرف اور نیکی اور بھلائی کے کاموں کی طرف دعوت دینے کے لئے بھیجا ہے تاکہ وہ تمہاری مغفرت فرمائے بعینہ اسی قسم کا پیغام ہم کو نوح علیہ السلام کی دعوت میں ملتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ	ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف
قَوْمِهِ أَنْ أَنذِرْ قَوْمَكَ	بھیجا کہ اپنی قوم کو ان پر دردناک
مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَهُمْ	عذاب آنے سے پہلے ہوشیار کرو۔

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۔ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۔ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ۔ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى الاية

(نوح: ۱-۴)

اس نے دعوت دی کہ اے میری قوم کے لوگو، میں تمہارے لئے ایک اچھی طرح کھول کر ڈرانے والا بنکر آیا ہوں کہ اللہ ہی کی بندگی کرو، اسی سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ تمہارے گناہوں کو بخشے گا اور ایک معین مدت تک تم کو مہلت دیگا۔

غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہاں ترہیب و ترغیب دونوں کو ایک ساتھ جمع کر دیا گیا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ قرآن مجید کے اکثر قصوں میں ان دونوں چیزوں کو جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے مثلاً سورہ حجر میں حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کی جو سرگذشتیں بیان ہوئی ہیں ان کی تمہید اس طرح شروع ہوتی ہے:-

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۔ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ۔ وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ

(حجر: ۴۹-۵۱)

میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں ہی در اصل بخشنے والا مہربان ہوں اور میرا ہی عذاب دردناک ہے اور ان کو ابراہیم کے مہمانوں کی بھی خبر دے دو۔

اسی طرح سے یہاں قوموں کے جو قصے بیان ہوئے ہیں وہ محض ڈرانے ہی کے لئے نہیں

بیان کئے گئے ہیں بلکہ ان کے بیان سے یہ مقصود بھی ہے کہ لوگوں کو خدائے رحمان و رحیم کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دی جائے۔

توحید، معاد اور رسالت کی کھلی کھلی دلیلوں کی طرف اشارہ کرنے اور مذکورہ تین بنیادی چیزوں میں سے اللہ واحد کی طرف دعوت دینے کے بعد کلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کی طرف مڑ گیا ہے اور یہ تسلی کا مضمون بھی اپنے اندر بہت سے اہم پہلو رکھتا ہے۔ تسلی کا یہ مضمون قرآن مجید میں جگہ جگہ آیا ہے اور بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ یہ سورتوں کے آخر میں آیا ہے۔ اس کے بعض شواہد سابق سورہ کی تفسیر میں بیان ہو چکے ہیں۔ اسی اصول کے مطابق اس سورہ کو بھی تسلی کے مضمون پر ختم کیا ہے اور اس کے لئے اسلوب جیسا کہ تم دیکھو گے، ایسا جامع اختیار کیا ہے کہ بہت سی اہم باتیں اس کے اندر سمٹ آئی ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے:-

كَذَٰلِكَ مَا أَتَى الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا قَالُوا
سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ ۝٥٢ أَتَوَاصَوْا بِهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ ۝٥٣
فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَا أَنتَ بِمَلُومٍ ۝٥٤ وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ
تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ ۝٥٥ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝٥٦
مَا أُرِيدُ مِنْهُم مِّن رِّزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَن يُطْعِمُونِ ۝٥٧
إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ۝٥٨ فَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا
ذَنُوبًا مِّثْلَ ذَنُوبِ أَصْحَابِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُونِ ۝٥٩ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ

كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ۝

ایسے ہی ان کے اگلوں کے پاس نہیں آیا کوئی رسول مگر انھوں نے اس کو جادوگر یا دیوانہ ٹھہرایا۔ کیا انھوں نے ایک دوسرے کو اس بات کی وصیت کر چھوڑی ہے؟ بلکہ یہ سرکش لوگ ہیں۔ پس تم ان سے اعراض کرو تم پر کوئی الزام نہیں ہے۔ اور نصیحت کرو کیونکہ نصیحت ایمان والوں کو نفع پہنچاتی ہے۔ میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر اس لئے کہ وہ میری بندگی کریں۔ میں ان سے نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ رزق کا سامان کریں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔ بلا شبہہ اللہ ہی روزی رساں، زور آور اور قوت والا ہے۔ پس ان ظالموں کے لئے بھی ویسا ہی مقرر پیمانہ ہے جیسا ان کے اگلے ہم مشربوں کے لئے تھا۔ تو جلدی نہ مچائیں۔ ان کافروں کے لئے ان کے اس دن کے سبب سے بڑی خرابی ہے جس کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے۔

۴ ۲ ـ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

(۵۲ ـ ۶۰)

كَذٰلِكَ الآیۃ یہاں سے مستقل جملہ شروع ہوتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ علیحدہ خطاب ہے۔ "كَذٰلِكَ" سے اشارہ ہے اس تکذیب کی طرف جو پچھلی امتوں نے اپنے نبیوں اور رسولوں کی کی ہے۔ گویا پوری بات یوں ہوئی کہ جس طرح مذکورہ

امتوں نے اپنے اپنے رسولوں کو جھٹلایا اسی طرح تمھاری قوم سے پہلے ہر قوم نے اپنے اپنے رسول کی تکذیب کی ہے۔ اس وجہ سے تم ان کے حال پر غم نہ کرو اور حق کے غلبہ میں جو دیر ہو رہی ہے اس کے سبب سے بددل ہو کر فتح کے لئے جلدی نہ کرو۔

قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ اوپر حضرت موسیٰ کے بارے میں فرعون کا قول گذر چکا ہے۔ "فَتَوَلّٰی بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ" (اس نے گھمنڈ کے ساتھ منہ موڑا اور بولا کہ یہ تو جادوگر ہے یا دیوانہ) اسی طرح کی بات ہر جھٹلانے والی قوم نے اپنے اپنے نبی کو کہی اور قرآن میں آیا ہے کہ یہی بات کفار عرب نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہی۔ یہاں ان کے اسی قول کی طرف اشارہ ہے۔

اَتَوَاصَوْا بِهٖ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ یہاں حرف استفہام اظہار تعجب اور اظہار کراہت کے لئے ہے، اور "بل" سامع کو ظاہر سے موڑ کر اصل حقیقت کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ گویا پوری بات یوں ہوئی کہ ـــــــ ان کا اللہ کے رسول کو جادوگر اور دیوانہ کہنا کس قدر خلاف حقیقت بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے اگلوں نے پچھلوں کو اس کی وصیت کر چھوڑی تھی اور یہ اخلاف بغیر اس کے کہ اپنی عقل کو کام میں لائیں اپنے اسلاف کی بات دہراتے چلے جا رہے ہیں۔ پھر اس بات سے رخ بدل کر اصل حقیقت کی طرف توجہ دلا دی کہ یہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں محض اپنی سرکشی اور غرور کے سبب سے کہہ رہے ہیں۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَا أَنْتَ بِمَلُوْمٍ

یعنی ان سے اعراض کرو اور ان کو مہلت دو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کا حکم جو دیا جاتا ہے اس کا مقصد یہ نہیں ہوا کرتا کہ آپ قطعی طور پر ہمیشہ کے لئے ان سے اعراض ہی کر لیں بلکہ اس سے مندرجہ ذیل مقاصد پیش نظر ہوتے ہیں۔

ایک یہ کہ ان لوگوں کو کچھ عرصہ کے لئے نظر انداز کیا جائے کہ ان کی مخالفت کی شدت کچھ کم ہو جائے۔

دوسرا یہ کہ ان کی گستاخی اور بدتمیزی کو کریم النفسی کے ساتھ درگذر کیا جائے اور ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کیا جائے۔ چنانچہ فرمایا ہے:۔

فَذَكِّرْ، إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ إِلَّا مَنْ تَوَلَّى وَكَفَرَ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ۔

(غاشیہ: ۲۱-۲۶)

تم یاددہانی کرو، کیونکہ تم صرف یاددہانی کرنے والے ہو تم ان کے اوپر داروغہ نہیں مقرر کئے گئے ہو۔ رہا وہ جس نے منہ موڑا اور کفر کیا تو اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا۔ بیشک ہماری طرف ہے ان کا لوٹنا۔ پھر ہمارے ذمہ ہے

دوسری جگہ فرمایا ہے:۔

فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ

تمہارے ذمہ تو صرف پہنچا دینا ہے

وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ — اور ہماری ذمہ داری ہے ان سے مواخذہ کرنا۔ (رعد: ۴۰)

تیسرا یہ کہ انبیاء کو اس بات سے روکا جائے کہ وہ لوگوں کو مسلمان بنانے کی خواہش میں ان کے پیچھے پڑ جائیں اور ان کے غم میں اپنے آپ کو ہلکان کریں۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے۔ مثلاً :-

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰٓ اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا۔ (کہف: ۶) — اگر یہ لوگ اس دعوت پر ایمان نہ لائے تو شاید تم ان کے پیچھے اپنے آپ کو غم کے سبب ہلاک کر کے رہو گے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے :-

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ (فاطر: ۸) — تمہاری جان ان کے غم میں ہلکان نہ ہو۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔

ان وجوہ سے جب کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کے اعراض کا حکم دیا گیا ہے تو اس کے ساتھ چند باتیں لازمی طور پر آئی ہیں۔ ایک منکرین دعوت کے لئے دھمکی۔ دوسری اہل ایمان کے لئے نصرت الٰہی کا وعدہ۔ تیسری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی کہ حجت تمام کر دینے اور دعوت پوری طرح پہنچا دینے کے بعد آپ بری الذمہ ہو چکے، اس کے بعد ان کے لئے

پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ چوتھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو توکل اختیار کرنے اور نماز پڑھتے رہنے کی نصیحت اور اس بات کی تلقین کہ کفار کو جو مہلت دی جا رہی ہے اس کے سبب سے آپ پریشان اور آزردہ خاطر نہ ہوں بلکہ آپ اللہ کے فیصلہ پر راضی رہیں وہی آپ کا وکیل ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ وہ لوگوں کو عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا تاکہ جن لوگوں کو توبہ کرنی ہو وہ توبہ کر سکیں، پس اہل ایمان اور پیغمبر کا فرض یہ ہے کہ وہ صبر کریں، درگذر کریں اور حق کے غلبہ کا انتظار کرتے رہیں۔

یہ جو کچھ ہم نے لکھا ہے قرآن مجید میں اس پر نہایت واضح دلیلیں موجود ہیں۔ مثلاً:۔

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا۔ وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا۔ إِنَّ لَدَيْنَا أَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا۔ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا أَلِيْمًا۔

(مزمل: ۱۰-۱۳)

اور جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس پر صبر کرو اور ان کو خوبصورتی کے ساتھ نظر انداز کرو۔ اور مجھ کو اور ان صاحب عیش و نعمت جھٹلانے والوں کو چھوڑ دو۔ ان کو ذرا مہلت دو۔ بیشک ہمارے پاس عبرت انگیز سزائیں ہیں اور جہنم ہے اور حلق میں پھنس جانے والا کھانا ہے اور دردناک عذاب ہے۔

دوسرے مقام میں ہے:۔

وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ۔
اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ۔
الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ
اِلٰهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ۔
وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ
صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ۔
فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ
مِّنَ السّٰجِدِيْنَ وَاعْبُدْ
رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ
الْيَقِيْنُ۔

(حجر: ۹۴-۹۹)

اور ان مشرکین سے اعراض کرو
ہم تمھاری طرف سے ان مذاق اڑانے
والوں کے لئے کافی ہیں جو اللہ
کے ساتھ دوسرے معبودوں کو
شریک بنا رہے ہیں، وہ عنقریب
جان لیں گے، ہم کو معلوم ہے کہ
ان کی باتوں کے سبب تمھارا
دل آزردہ ہوتا ہے۔ تو اپنے رب
کی اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو
اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو اور اپنے
رب کی بندگی کرو یہاں تک کہ یقین آجائے۔

ایک اور جگہ ہے:-

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا
لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ۔
اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ
وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ۔
فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ

اور اپنے مرسل بندوں کے بارہ میں
ہمارا یہ وعدہ پہلے ہو چکا ہے کہ ہماری
مدد انہی کو حاصل ہوگی اور یہ کہ
ہمارا ہی لشکر غالب رہے گا، پس
کچھ وقت کے لئے ان سے اعراض کرو

وَّاَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ - اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ - فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَاۗءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ، وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ وَّاَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ۔
(صٰفّٰت : ۱۷۱-۱۷۹)

اور ان کو دیکھو وہ بھی عنقریب دیکھ لیں گے۔ کیا وہ ہمارے عذاب کے لئے جلدی مچائے ہوئے ہیں؟ جب وہ ان کی بستی میں اتریگا تو کیا ہی منحوس ہوگی ان کی صبح جن کو ہوشیار کیا جاچکا ہے۔ اور ان سے اعراض کرو کچھ وقت کے لئے اور ان کو دیکھو وہ بھی جلد دیکھ لیں گے۔

سورۂ شعراء پوری کی پوری اسی حقیقت کی وضاحت کر رہی ہے اس میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ اگرچہ منکرین کی اکثریت ایمان لانے والی نہیں ہے تاہم اللہ تعالیٰ کسی قوم کو پکڑنے میں جلدی نہیں کیا کرتا اس وجہ سے پیغمبر کو چاہیئے کہ فیصلہ میں جو دیر ہو رہی ہے اس کے سبب سے غمگین نہ ہو چنانچہ اس چیز کو ثابت کرنے کے لئے اس میں مختلف قوموں کی سرگذشتیں سنائی گئی ہیں اور ہر سرگذشت کے بعد یہ آیت آئی ہے:-

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَّمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۔

بیشک اس کے اندر دلیل ہے اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور بیشک تیرا رب ہی غالب اور رحمت والا ہے۔

وَذَكِّرْ یعنی ان لوگوں سے اعراض کے ساتھ ساتھ جہاں تک عام دعوت و نصیحت کا تعلق ہے اس کو جاری رکھو کیونکہ فائدہ اٹھانے والوں کو یہ چیز فائدہ پہنچاتی ہے۔

اَلذِّكْرٰى اگرچہ یہاں اس سے مراد عام پند وموعظت ہے لیکن خاص اشارہ آخرت کی یاددہانی کی طرف ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے "وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ" (اور ان کو اللہ کے تاریخی دنوں کے ذریعہ سے یاددلاؤ) حشرونشر کے دلائل بیان کرنے کے بعد عموماً یہ آیت آتی ہے۔ "اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى" (بے شک اس کے اندر یاددہانی ہے) بعض جگہ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى (بصیرت اور یاددہانی) کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

ذُوالْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ لفظ مَتِیْن پر چونکہ وقف ہے اس وجہ سے اس کا اعراب ظاہر نہیں ہوتا اور چونکہ اس کا اعراب ظاہر نہیں ہوتا اس وجہ سے اس میں قرأت کے کسی اختلاف کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ البتہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس کا اعراب ہے کیا؟ بعض اس کو مجرور سمجھتے ہیں اور اس کو قوت کی صفت قرار دیتے ہیں۔ قوت دراصل رسی کی لڑ کو کہتے ہیں اور رسی کی مضبوطی کے لئے عربی میں متین کا لفظ عام طور پر استعمال ہے۔ یہاں ایک شبہہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ قوت کا لفظ مونث ہے اور متین کا لفظ مذکر ہے۔ لیکن یہ شبہہ صحیح نہیں ہے۔ متین کا لفظ فَعِیْل کے وزن پر ہے اور عربی زبان میں فعیل کا وزن مذکر اور مونث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں فرمایا ہے:۔

اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ — اللہ کی رحمت محسنوں سے

مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۔ (اعراف : ۵۶) قریب ہے ۔

بعض لوگ اس کو حالت رفع میں سمجھتے ہیں اور اس کو ذُوالقُوَّةِ کی صفت قرار دیتے ہیں لیکن متین کا لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت کی حیثیت سے کہیں اور نہیں استعمال ہوا ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کا ایک فاعل محذوف مانا جائے اور یہ فرض کیا جائے کہ در اصل یہ المتین تو تہ ہے اس پہلو سے یہ اختلاف محض اعراب کا اختلاف ہوگا، تاویل دونوں صورتوں میں ایک ہی رہے گی۔

ذَنُوْباً ذنوب بھرے ہوئے ڈول کو کہتے ہیں۔ خالی ڈول کو ذنوب نہیں کہیں گے۔ یہاں سے یہ لفظ حصہ اور نصیب کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ ابو ذویب کا شعر ہے ؎

لعمرك والمنايا غالبات لكل بنى اب منها ذنوب

تیری جان کی قسم، موت سے مفر نہیں، اور ہر باپ کے بیٹوں کے لئے اس میں حصہ ہے

علقمہ بن عبدہ ایک شخص کی تعریف میں کہتا ہے ؎

وفی کل قوم قد خبطت بنعمۃ فحق لشاش من نداك ذنوب

اور تونے ہر قوم کو اپنی فیاضیوں سے نوازا ہے تو شاش بھی حقدار ہے کہ تیری فیاضی میں سے حصہ پائے۔

زیر بحث آیت میں "ذنوب" سے مراد زندگی کی وہ محدود مدت ہے جو ان کفار کے حصہ میں آئی ہے قرآن کا منشا یہ ہے کہ اس مدت کے اندر جو عیش و آرام وہ کرنا چاہتے ہیں وہ کرلیں یہاں تک کہ پیمانۂ مدت لبریز ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو رزق اور جو مہلت

ان کے لئے مقدر ہے وہ بھی ان کو مل جائے اور جو بدیاں اور جو شرارتیں یہ کرنے والے ہیں وہ بھی یہ کرلیں۔ اس کے بعد اللہ کا عذاب ان کے اوپر آجائے گا۔ غور کیجئے کہ اس مضمون کے ادا کرنے کے لئے 'ذنوب' کا لفظ کس قدر موزوں استعمال ہوا ہے بعد والی آیت سے اس مضمون کی تائید ہو رہی ہے۔ قرآن میں اس مضمون کی موید آیتیں اور بھی ہیں۔ مثلاً:۔

وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ	اور تیرا رب مغفرت کرنے والا اور
لَوْ يُؤَاخِذُهُم بِمَا كَسَبُوا	رحمت کرنے والا ہے اور اگر ان کے
لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ،	عمل پر وہ فوراً مواخذہ کرتا تو
بَل لَّهُم مَّوْعِدٌ لَّن يَجِدُوا	ان پر فوراً عذاب بھیج دیتا لیکن ان
مِن دُونِهِ مَوْئِلًا۔	کے لئے ایک وعدہ ہے اس کے سوا
(کہف: ۵۸)	وہ کہیں پناہ نہیں پائیں گے۔

اس آیت میں وعدہ سے مراد عذاب کا مقررہ وقت ہے۔ اسی طرح ذنوب سے مراد زندگی کی وہ مہلت ہے جو ان کفار کو اللہ تعالیٰ نے بخشی ہے۔ جب وہ اس مہلت کے اندر خدا کی ان نعمتوں سے فائدہ اٹھالیں گے جو خدا نے ان کے لئے مقدر کی ہوں گی اور وہ سارے کام بھی وہ کر چکیں گے جو وہ کرنے والے ہیں تو ان کا پیمانہ لبریز ہو جائے گا یعنی زمانہ کی جو مقدار ان کے لئے مقدر ہے وہ پوری ہو جائے گی۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ سے ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ تک کی تاویل

یہ تینوں آیتیں نہایت اہم مطالب پر مشتمل ہیں۔ ان میں ہماری پیدائش کا مقصد بیان کیا گیا ہے، پھر اس مقصد سے جو جزا و سزا لازم آتی ہے اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ نیز اس میں اہل ایمان کے لئے خوشخبری اور منکرین کے لئے دھمکی بھی ہے۔ چنانچہ ہم اس فصل میں ان باتوں کا بعض دوسری اہم حقیقتوں کے ساتھ ذکر کریں گے۔

ان آیات کے نظم کے اندر جزا اور سزا کی ایک نہایت اہم دلیل چھپی ہوئی ہے اور فوراً نہ پکڑے جانے کے سبب سے منکرین کو جزا و سزا کے بارہ میں جو شبہہ ہو رہا ہے اس کا ان آیات میں ازالہ کیا گیا ہے اور اس پہلو سے ان کا تعلق آگے اور پیچھے کے اس مضمون سے بھی واضح ہو رہا ہے جو کفار سے اعراض کے بارہ میں یہاں دیا گیا ہے۔ ہم ان تمام اشارات کو اچھی طرح روشنی میں لانے کے لئے چاہتے ہیں کہ یہاں ان آیتوں پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں۔

ان آیات کے سیاق سے یہ صاف واضح ہو رہا ہے کہ یہاں مقصود اس اعراض اور اس مہلت کی حکمت بیان کرنا ہے جس کا حکم ان منکرین کے بارہ میں آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے اور جس کی تصریح قرآن مجید میں مختلف مواقع پر آئی ہے یہاں یہ آتییں بالکل دلیل کے طور پر آئی ہیں۔ اوپر کی آیات میں "فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَا اَنْتَ بِمَلُوْمٍ" سے لیکر "الْمُؤْمِنِيْنَ" تک جو بات کہی گئی تھی، ان آیتوں میں اسی کی دلیل بیان کر دی گئی ہے۔

اس دلیل کی تفصیل یہ ہے کہ آقا جس طرح اپنے خدام سے مختلف قسم کی خدمتیں لیا کرتے ہیں، یا یہ چاہتے ہیں کہ وہ ان کے لئے فراہمی رزق اور قوت اور شوکت کا ذریعہ بنیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور جنوں کو اس طرح کے کسی مقصد کے لئے نہیں پیدا کیا ہے۔ رزق اور معیشت کے سارے وسائل وہ خود اپنے بندوں کے لئے فراہم کرتا ہے۔ وہ کسی پہلو سے ان کی طرف سے کسی خدمت یا کسی مدد کا محتاج نہیں ہے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اس نے انسانوں کو پیدا کر کے بس یونہی انھیں چھوڑ دیا ہے اور اب ان سے اس کو کوئی سروکار نہیں رہا ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے بے شبہہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی کسی غرض کے لئے نہیں پیدا کیا ہے۔ کیونکہ وہ ہر احتیاج سے بالاتر ہے لیکن اس نے انسانوں کو اس لئے ضرور پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں اور اس کے قرب کی سعادت حاصل کر کے دین و دنیا کی تمام حسنات سے متمتع ہوں۔ جو شخص معاملہ کے اس پہلو پر غور کرے گا اس سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ انسان کی تمام سعادت و کامرانی اس بات کے اندر مضمر ہے کہ وہ اپنے رب کی بندگی اور اس کے احکام کی تعمیل کرے کیونکہ اس نے انسانوں کو اسی

باتوں کا حکم دیا ہے جن میں خود اُن کی اپنی صلاح و فلاح ہے۔ اور درحقیقت یہی وہ اصل مقصود ہے جس کے لئے انسان کو وجود بخشا گیا ہے۔ انسان کی خلقت کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس کے لئے کمال کی راہیں کھولی جائیں۔ یہ کمالات خود اس کے وجود کے اندر ودیعت ہیں جو اس کی خلقت سے ظہور میں آتے ہیں اور پھر وہ درجہ بدرجہ قوت سے فعل کی صورت اختیار کرتے ہیں پھر ان سے دوسرے کمالات ظہور میں آتے ہیں یہاں تک کہ انسان آہستہ آہستہ ترقی اور کمال کے آخری نقطہ تک پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعاً اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ،	جو شخص عزت کا طالب ہو تو اسے چاہئے کہ اللہ کے پاس عزت حاصل کرے کیونکہ عزت ساری کی ساری اللہ ہی کے لئے ہے۔ پاکیزہ کلمے اس کی طرف چڑھتے ہیں اور عمل صالح اس کو بلند کرتے ہیں۔
(فاطر: ۱۰)	

اس اصل حقیقت سے دو باتیں لازم آتی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو عذاب دینے میں جلدی نہیں کیا کرتا بلکہ ان کو مہلت دیتا ہے تاکہ جن لوگوں کے اندر ذرا بھی استعداد موجود ہو ان کی وہ استعداد بروئے کار آسکے اور ان پہ اللہ کی حجت پوری ہو جائے۔ چنانچہ فرمایا ہے :-

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَابَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ إِلٰى أَجَلٍ مُّسَمًّى

(نحل: ۶۱)

اور اگر اللہ لوگوں سے ان کے ظلم پر فوراً مواخذہ کرتا تو روئے زمین پر ایک جاندار کو بھی زندہ نہ چھوڑتا۔ لیکن وہ لوگوں کو ایک مدت متعین تک مہلت دیتا ہے۔

دوسری یہ کہ جب لوگ برائیوں سے باز نہیں آتے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کا عذر ختم کر دیا جاتا ہے تو پھر لازماً وہ ہلاک کر دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے:۔

وَتِلْكَ الْقُرٰى أَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا۔

(کہف: ۵۹)

اور یہ بستیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا جب کہ انھوں نے ظلم کیا اور ہم نے ان کی ہلاکت کے لئے ایک وقت ٹھہرایا۔

ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ بھی دو پہلوؤں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ایک یہ کہ جنات اور انسان خدا کے ساتھ اس نوعیت کا تعلق نہیں رکھتے جس نوعیت کا تعلق خدام اپنے مالکوں اور غلام اپنے آقاؤں کے ساتھ رکھتے ہیں کہ ان کی فراہمی رزق کی تمام سرگرمیوں اور ان کی عزت و شوکت کی تمام نمائشوں کا انحصار ان خدام ہی پر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر وہ خدمت سے

انکار کر بیٹھیں تو ان کی خدائی کا سارا قصر ہی مسمار ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کی مدد سے بالکل مستغنی ہے۔ اس کی سلطنت خود اپنے بل پر قائم ہے۔ اس کو نہ کسی کی مدد و اعانت کی احتیاج ہے اور نہ کسی کی مخالفت اس کو کوئی نقصان پہنچا سکتی۔

دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ اگر ان لوگوں کو کچھ مدت کے لئے مہلت دیتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اس کی گرفت سے باہر ہو گئے۔ وہ ہر وقت اس کے قابو میں ہیں۔ وہ جب چاہے ان کو پکڑ سکتا ہے۔ اپنی اسی قوت اور قدرت کی وجہ سے وہ لوگوں کو پوری ڈھیل دیتا ہے کیونکہ اس کو اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ کوئی شخص اس کے دائرۂ اختیار سے باہر نکل جائے گا۔

ہم نے اوپر جو کچھ بیان کیا ہے اس کی روشنی میں اگر ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ﴾ سے لے کر ﴿الْمَتِينُ﴾ تک کے ٹکڑے پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ ٹکڑا منکرین سے متعلق اور اسی طرح پیغمبر (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ) سے متعلق دو باتیں ہمارے سامنے لاتا ہے۔ منکرین سے متعلق اس سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ ایک خاص مدت تک کے لئے ان کو ڈھیل دی جاتی ہے اس کے بعد پھر ان کو ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق لوگوں کو حق کی تبلیغ کریں اور ان کے ایمان لانے اور نہ لانے کی پریشانی میں اپنے آپ کو مبتلا نہ کریں اور یہ کہ جو وقت دعوت سے بچے وہ نماز اور ذکر الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح میں صرف کریں۔

اس مضمون کی وضاحت ان آیات سے بھی ہوتی ہے جو اسی مضمون کی ہیں

اور قرآن میں دوسری جگہ وارد ہیں مثلاً :۔

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ	اور تم اپنے گھر والوں کو نماز کا
وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا، لَا نَسْأَلُكَ	حکم دو اور اس پر جمے رہو۔ ہم تم سے
رِزْقًا، نَحْنُ نَرْزُقُكَ	رزق رسانی کا مطالبہ نہیں کرتے
وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى۔	ہم تم کو روزی دیتے ہیں اور انجام کار
(طٰہٰ: ۱۳۲)	کی کامیابی تقویٰ کے لئے ہے۔

ان دونوں مقامات پر غور کرو۔ دونوں جگہ یہ بات واضح کی گئی ہے کہ اللہ تعالےٰ کسی کی خدمت کا محتاج نہیں ہے اور یہ کہ اس کی عبادت ضروری ہے۔ اسی طرح ایک سے زیادہ مقامات میں نماز کا، اللہ کی طرف متوجہ ہونے کا، اور منکرین کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرنے کا حکم تمھیں ایک ہی سلسلۂ بیان میں ملے گا۔ یہاں بھی یہ بات واضح کی ہے کہ ہم سب اللہ ہی کے بندے ہیں اور سارے معاملات اسی کی حکمت اور مشیّت کے تحت انجام پا رہے ہیں۔

اس ساری تفصیل سے واضح ہوا کہ ان آیات میں حکمت کی نہایت اہم باتیں بیان ہوئی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

(۱) جنوں اور انسانوں کو پیدا کرنے سے اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ لوگ اس کی بندگی کریں۔

(۲) عبادت اور خدمت کے درمیان نہایت کھلا ہوا فرق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا

مطالبہ بندوں سے عبادت کے لئے ہے، خدمت کے لئے نہیں ہے۔ اس سے ربوبیت کی اصل حقیقت واضح ہوتی ہے۔

(۳) انسان کے پیدا کئے جانے کی غایت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے گناہوں پہ اس کی فوراً گرفت نہ کی جائے بلکہ ایک خاص مدت تک اس کو مہلت دی جائے۔

(۴) انسان کے پیدا کئے جانے کی غایت اور اللہ تعالیٰ کے عدل کا تقاضا یہ ہے کہ جزا اور سزا واقع ہو اور بالآخر حق کو فتح حاصل ہو۔

(۵) اہل حق کو یہ نہیں چاہئے کہ وہ اس بات کی تمنا کریں کہ حق و باطل کی کشمکش کا فیصلہ فوراً ہو جائے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پہ راضی رہنا چاہئے کیونکہ جو کچھ ہوتا ہے اس کی حکمت، اس کے عدل، اور اس کی رحمت کے تحت ہوتا ہے۔

(۶) تمام عبادات کی جڑ نماز اور ذکر الٰہی ہے کیونکہ خضوع اور توکل جو عبادت کی روح ہے، نماز اور ذکر کے اندر کمال درجہ موجود ہے۔

ان آیات کا عمود اور مضمون آخرت کو ثابت کرتا ہے کیونکہ جنوں اور انسانوں کا کسی خاص مقصد کے لئے پیدا کیا جانا اس بات کی نہایت کھلی ہوئی دلیل ہے کہ ان سے ان کے اعمال کے بارہ میں ایک روز پرسش ہوگی اور اسی کے مطابق ان کو جزا اور سزا دی جائے گی۔ نیز اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ یہ دنیا ہمیشہ باقی رہنے کے لئے نہیں بنائی گئی ہے۔ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق ایک محدود مدت

کے لئے پیدا کی گئی ہے جس سے لازم آتا ہے کہ ایک دن حق کا غلبہ ہو کے رہے گا اور یہ باطل جو آج پایا جاتا ہے اس کی زندگی بالکل عارضی ہے۔ قرآن مجید میں متعدد جگہ اس بات کی تصریح کر دی گئی ہے۔ مثلاً :۔

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ	کتنی بستیاں ہم نے تباہ کر دیں
كَانَتْ ظَالِمَةً وَأَنْشَأْنَا	جو ظالم تھیں اور ان کے بعد
بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ۔	دوسری قومیں اٹھا کھڑی کیں
فَلَمَّا أَحَسُّوا بَأْسَنَا	جب ان کو ہمارے عذاب کا
إِذَا هُمْ مِنْهَا يَرْكُضُونَ۔	پتہ چلا وہ وہاں سے بھاگ کھڑی
لَا تَرْكُضُوا وَارْجِعُوا	ہوئیں۔ بھاگو مت، اپنے
إِلَىٰ مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ	سر و سامان عیش اور اپنے
وَمَسَاكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ	گھروں کی طرف لوٹو تاکہ تم سے
تُسْأَلُونَ۔ قَالُوا يَا وَيْلَنَا	پرستش کی جائے۔ وہ
إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ۔ فَمَا	پکاریں گے ہائے ہماری
زَالَتْ تِلْكَ دَعْوَاهُمْ	کم بختی، ہم ظالم تھے۔ وہ
حَتَّىٰ جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا	یہی پکارتے رہیں گے۔ یہاں تک
خَامِدِينَ۔ وَمَا خَلَقْنَا	کہ ہم ان کو بالکل پامال کر دیں گے۔
السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ	ہم نے آسمان اور زمین کو اور

وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ۔ لَوْ
اَرَدْنَا اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا
لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ
اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ۔ بَلْ
نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ
فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ
زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ
مِمَّا تَصِفُوْنَ۔ وَلَهٗ
مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَمَنْ عِنْدَهٗ
لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ
عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ۔
يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ
لَا يَفْتُرُوْنَ۔

(الانبیاء : ۱۱ - ۲۰)

جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کو
کھیل کرتے ہوئے نہیں بنایا ہے۔
اگر ہم چاہتے کہ کوئی کھیل بنائیں
تو اس کو اپنے پاس ہی بناتے۔
اگر ہم ایسا کرنے والے ہی ہوتے[1]
بلکہ ہم حق کو باطل پر ماریں گے
پس وہ اس کا بھیجا نکال دے گا
اور وہ نابود ہو جائے گا اور تمہارے
لئے ہلاکی ہے اس چیز کے سبب سے
جو تم بیان کرتے ہو اسی کے اختیار
میں ہیں جو آسمانوں اور زمین
میں ہیں اور جو اس کے پاس
ہیں اس کی بندگی سے نہ تو سرتابی
کرتے ہیں اور نہ تھکتے ہی ہیں۔
وہ رات دن خدا کی تسبیح کرتے
ہیں کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔

---

[1] یعنی اللہ تعالیٰ اس بات سے برتر ہے کہ وہ اس دنیا کی چیزوں میں سے کسی چیز سے جی بہلائے۔

ان آیات میں اس بات کو بالکل صاف واضح کردیا ہے کہ اللہ تعالیٰ برابر ظالم اور مفسد قوموں کو مٹاتا اور ان کی جگہ دوسروں کو برپا کرتا رہا ہے کیونکہ اس نے ان قوموں کو اپنی دلچسپی اور دل لگی کے لئے نہیں پیدا کیا تھا کہ ان کے ظلم و فساد کے تماشے دیکھتا رہتا اور ان سے کوئی مواخذہ نہ کرتا۔ اللہ تعالیٰ خود حق ہے اور وہ حق ہی کو پسند کرتا ہے اس وجہ سے برابر حق سے باطل کو توڑتا رہتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کے سوا ہر چیز باطل ہے۔ اگر اس کے سوا کسی چیز کی کوئی ہستی ہے تو وہ حق کے ساتھ اس کی نسبت اور حق کی بندگی کے سبب سے ہے۔ یہاں تک کہ خدا کے مقرب فرشتے بھی اپنی روز و شب کی بندگی ہی کی بدولت باقی ہیں۔ وہ برابر اللہ تعالےٰ کی عبادت کرتے رہتے ہیں اس وجہ سے ان کو باقی رہنے کا حق حاصل ہوا ہے۔ جو اس بندگی اور عبودیت کے حلقہ سے اپنے آپ کو الگ کرے وہ اپنے آپ کو اللہ کے غضب اور اس کے عذاب کا نشانہ بنا لیتا ہے۔

یہ ساری باتیں خدا کی کبریائی، اس کی حکمت، اس کے عدل اور اس کی رحمت پر دلیل ہیں۔ اور اس میں ظالموں اور سرکشوں کے لئے دھمکی اور خدا سے ڈرنے والوں اور نیکوکاروں کے لئے بشارت ہے۔

۲۶ — خاتمہ کی آیات کے نظم اور ان کے مطالب پر ایک نظر

اوپر کے مباحث سے یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ یہ ۹ آیتیں دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لئے نازل ہوئی ہیں لیکن تسلی کے مضمون کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل باتیں بھی ان سے واضح ہو رہی ہیں۔

(۱) ظالموں اور سرکشوں کی باتوں سے درگذر کیا جائے۔

(۲) مخالفتوں پر صبر کیا جائے اور حق کے غلبہ کا انتظار کیا جائے۔

(۳) اللہ تعالیٰ حکمت، رحمت، اور عدل کی صفات سے متصف ہے۔

(۴) ظالموں اور سرکشوں کو مہلت دینے میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے۔

(۵) اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لئے مدتیں مقرر کر رکھی ہیں۔

(۶) مخلوقات کو اللہ تعالیٰ نے ایک مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اور اس مقصد کے اندر ہی ان کی ترقی اور ان کا کمال مضمر ہے۔

(۷) ربوبیت اور عبودیت کی حقیقت کی وضاحت۔

(۸) جزا اور سزا لازمی ہے۔

یہ سارے مطالب اس حسن ترتیب کے ساتھ بیان ہوئے ہیں کہ آپ

سے آپ ایک سے دوسرے پر دلیل قائم ہوتی چلی گئی ہے اور کلام سابق سے لاحق کی طرف بڑھتا ہوا سورہ کے عمود یعنی انذار و تخویف تک پہنچ گیا ہے۔

استاذ امام مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ

کی

بعض عربی تصنیفات

فاتحہ نظام القرآن و تاویل الفرقان بالفرقان :- یہ کتاب استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تین کتابوں کا مجموعہ ہے۔ مقدمہ تفسیر نظام القرآن، تفسیر آیۂ بسم اللہ، تفسیر سورۂ فاتحہ۔ مقدمے میں مولانا نے اپنی تفسیر کے تمام اصول بیان کئے ہیں اور ان تمام اصولی مباحث سے تعرض کیا ہے جن کی قرآن پر تدبر کرنے والے ہر طالب کو عموماً پیش آتی ہے۔ یہ اصولی مباحث ۱۵ ہیں۔

آخر میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے۔ ان تفسیروں میں مصنفؒ نے جو حکیمانہ نکات و حقائق بیان کئے ہیں وہ مطالعے سے تعلق رکھتے ہیں، کتابت و طباعت عمدہ

قیمت ۱۲ ر

امعان فی اقسام القرآن :- اس کتاب میں قرآن مجید کی قسموں کے متعلق تمام اصولی مباحث کی تفصیل کی گئی ہے۔

اور اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو اس طرح بے نقاب کیا گیا ہے کہ اس نے اس باب میں بالکل

حرف آخر کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ یہ کتاب اپنے حجم کے اعتبار سے اگرچہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن اپنے معارف کے لحاظ سے صدہا کتابوں پر بھاری ہے۔ کتابت وطباعت عمدہ۔ (مطبوعہ مصر) قیمت ۸؍

الرای الصحیح فی من ہو الذبیح:۔ اس کتاب میں اہل کتاب کے دعوی کے خلاف قرآن مجید اور تورات کے نہایت محکم دلائل سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذبیح ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ کتابت وطباعت متوسط

قیمت ۱۲؍

تفسیر سورۃ الفیل:۔ اس کتاب کی ہر فصل ایک مستقل کتاب ہے۔ واقعۂ فیل کی اصلی حقیقت اس کتاب کی اشاعت سے پہلے بالکل مجہول تھی جس سے سورۂ کی تفسیر میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ مولانا نے کلام عرب کی مدد سے واقعے کی تمام تفصیلات فراہم کرکے تمام تاریخی غلطیوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ واقعۂ طیر کو بھی عجائب پرستی نے بالکل دوسرا رنگ دیدیا تھا، مولانا نے اس واقعے کے متعلق بھی عینی شاہدوں کی شہادتیں جمع کرکے اس کی اصلی حقیقت آشکارا کردی ہے اور اسی سلسلے میں رمی جمرات اور حج کے دوسرے مراسم کے اسرار وحکم نہایت شرح وبسط کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ کتابت وطباعت عمدہ، قیمت ۸؍

تفسیر سورۂ لہب:۔ اس کتاب میں اس عام خیال کی مدلل تردید کی گئی ہے کہ یہ سورۂ بددعا ہے۔ ابولہب اور اس کی بیوی کے وجوہ ذکر نہایت اثر انگیز ہیں۔ اس تفسیر کی اصلی عظمت کا

کا اندازہ صرف مطالعے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت وطباعت عمدہ، قیمت ۴ر

مفردات القرآن: - اس کتاب میں استاذ امامؒ نے قرآن مجید کے بعض مشکل الفاظ کی جن کے بارہ میں وہ دوسرے مفسرین اور عام اہل لغت سے اختلاف رکھتے تھے تحقیق بیان کی ہے اور کلام عرب سے اپنے قول کی تائید میں دلائل پیش کئے ہیں۔ قابل دید چیز ہے۔ کتابت وطباعت عمدہ، قیمت ۱۲ر

جمہرۃ البلاغۃ: - اس کتاب میں استاذ امامؒ نے مروجہ علم بلاغت کو جو سکاکی اور جرجانی کی کتابوں میں ہے یونانیوں سے ماخوذ ثابت کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ عربی ادب خصوصاً قرآن حکیم کی خوبیوں کو جانچنے کے لئے یہ فن بلاغت کسی طرح کسوٹی کا کام نہیں دے سکتا ساتھ ہی فصحائے عرب کے کلام سے بلاغت کے وہ اصول متعین کئے ہیں جو قرآن حکیم کی بلاغت کو پرکھنے کے لئے معیار کا کام دے سکتے ہیں۔ کتابت وطباعت عمدہ، قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ

دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر

اعظم گڈھ

مصنفؒ کی دوسری کتابوں کے اردو ترجمے

مقدمہ تفسیر نظام القرآن - یہ کتاب استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی بے نظیر تصنیف "فاتحہ نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان" کا اردو ترجمہ ہے اس کتاب میں مولاناؒ نے اپنی تفسیر نظام القرآن کے وہ اصول بیان کئے ہیں۔ جن کی ضرورت قرآن مجید پر تدبر کرنے والے ہر طالب کو عموماً پیش آتی ہے۔ کتابت وطباعت عمدہ

قیمت ۷۵ نئے پیسے

تفسیر آیۃ بسم اللہ وسورۂ فاتحہ:۔ اس کتاب میں مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے جو حکیمانہ نکات وحقائق بیان کئے ہیں وہ مطالعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ کتابت وطباعت عمدہ۔ قیمت صرف ۲۸ نئے پیسے

ملنے کا پتہ:۔

دائرۂ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر

اعظم گڈھ